

نکارنگ کہانیوں کے آراستہ دلچسپ حریہ

# ماہنامہ خانی کچی

عظیم  
کستانی پور  
کام

عبد  
منار



## ابتدائیہ

8	مشتاق احمد قریشی	دستک
10	عمران احمد	گفتگو
19	طاہر قریشی	اقراء
	سچی کھانیاں	
119	آلشہ مخدوم	فریب
129	شہنی ارشاد	کٹھن رات
187	خلیل جبار	ضرورت
199	ریاض بٹ	ہیروں کا ہار
	ناول	
21	رشید پیرزادہ	درندہ

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر بمیل سن مطبوعہ ابن سن پرنٹنگ پرس ہائی اسٹیڈیم کراچی  
دفتر کتابت 7 منیرہ چیئرمین عبد اللہ ہارون روڈ کراچی

## مغرب سے انتخاب

69	راحیلہ تاج	جازت نامہ
73	شکیل صدیقی	پیامہ نفرت
	مستقل سلسلے	
83	شہناز بانو	گردش
147	امجد جاوید	قلندر ذات
221	شیم نوید	جگت سنگھ
209	حافظ شبیر احمد	روحانی مسائل
213	عمر اسرار	خوشبو سخن
217	عفان احمد	ذوق آگہی

خط و کتابت کا پتہ ماہنامہ افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74 200 فون نمبرز 2/771-3562021-021

فیکس 021-35620773 کیاڑ مطبوعات نے افق پبلی کیشنز پرائیویٹ لیمیٹڈ سے رابطہ کیا۔  
Info@aanchal.com.ph



## دستک مشتاق احمد قریشی

ٹریفک جام کیوں ہوتا ہے.....؟

کراچی کی آبادی میں ہر لمحہ ہر لمحہ اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ بچے پیدا ہونے کے علاوہ ہے۔ بیرون شہر سے دور دراز کے دیہی علاقوں سے پاکستان کے طول و عرض سے انسانوں کا سیلابی ریلہ ہے کہ کراچی کے سمت بڑھا چلا آ رہا ہے۔ کراچی شہر کی یہ خوبی ہے لاکھ کثرت انسانی کے باوجود بہت کم افراد بھوکے پیٹ سوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہی رزق عطا فرماتا ہے کہ یا زیادہ یہ ایک الگ بحث ہے۔ جوں جوں کراچی کی آبادی بڑھ رہی ہے توں توں مختلف قسم کی گاڑیوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ موٹر سائیکلوں کی بھرمار ہو رہی ہے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے چینی کے خوشبو پرچیوں میں ابل سے ابل پڑی ہوں، یہ ماننا پڑے گا کہ چین نے موٹر سائیکلیں بنانا آسان کر دیا یا بنی بنائی موٹر سائیکلیں سستی پاکستان پہنچا کر انہیں اس قدر عام کر دیا ہے کہ ہزار ہا آٹھ سو ماہانہ بچت کرنے والا بھی آسانی سے صاحب موٹر سائیکل بن سکتا ہے۔ ظاہر ہے جتنی زیادہ مختلف قسم کی سواریاں سڑکوں پر آئیں گی۔ سڑکیں اتنی ہی تنگ ہوتی جائیں گی۔ گزشتہ چند سالوں میں کراچی کی سڑکوں پر ٹریفک جام معمول بننا جا رہا ہے اور کبھی دن جاتے ہیں کہ ہر طرف ٹریفک کا سیلاب جام کھڑا نظر آئے گا۔ دن بہ دن ٹریفک جام سے جام ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ شہری حکومت کی انتظامیہ نے جی جان سے کراچی کی سڑکوں کی توسیع و مرمت کا نہ صرف کام کیا بلکہ کئی اور ریزر جوں شہر کو راستہ بھی کیا۔ اس کے باوجود ٹریفک جام کا مسئلہ روز بروز گہرا ہو رہا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت کراچی شہر چند لاکھ کی آبادی والا شہر تھا اس اعتبار سے اس کی سڑکیں گلیاں بنائی گئی تھیں۔ اس کے باوجود کافی عرصے تک کراچی کی تمام اہم اور بڑی شاہراہوں پر ٹرام چلا کرتی تھی۔ جس کی دور دراز پکڑی تھی۔ ایک جانے کے لیے ایک آنے والی ٹرام کے لیے اور سڑکوں پر عام طور پر گھوڑا گاڑیاں اور چند ایک بسیں تھیں یا پھر ایسے رکشے تھے جنہیں انسان کھینچا کرتے تھے۔ مال سامان ادھر سے ادھر یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے گدھا گاڑی اور اونٹ گاڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ پورے شہر میں چند امراء کے پاس کاریں تھیں اور چند صاحب حیثیت لوگوں کے پاس اکا دکا موٹر سائیکلیں تھیں۔ عام طور پر سائیکل پر سفید پوش سفر کیا کرتے تھے۔ سڑکیں عام طور پر خالی ہی رہا کرتی تھیں لیکن آج ان ہی کشادہ اور سنسان رہنے والی سڑکوں شاہراہوں پر تل دھرنے کو جگہ دستیاب نہیں ہوتی۔ ادھتار یعنی آج کے تین پیسوں میں ٹرام میں کراچی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جایا جاسکتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ نا صرف انسانی آبادی میں اضافہ ہوا بلکہ نئی نئی بستیوں بھی بستی چلی گئیں۔ سارا انتظام از خود بغیر کسی پیشگی منصوبہ بندی کے چل پڑا اور جن بستیوں کو باقاعدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت بسایا گیا۔ ان کی منصوبہ بندی میں بھی مستقبل کا کوئی خیال نہ رکھا گیا۔ حالانکہ منصوبہ سازوں کو سوچنا چاہیے تھا کہ کراچی واحد بندرگاہ ہے۔ دنیا بھر سے تجارتی مال آتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی نو وطن عزیز کا پہلا دار الحکومت بھی تھا۔ اس وجہ سے بھی ہر قسم کے ضرورت مندوں کا رخ کراچی کی طرف ہوتا تھا۔ کراچی کے ارد گرد بہترین صنعتیں قائم ہوئیں اور شہر شروع ہوئیں۔ کراچی سنٹرل جیل جو شہری آبادی سے دوسری اہم شہر کا حصہ بن چکی ہے۔ ایسے ہی کراچی ائیر پورٹ جو شہر سے کوسوں دور تھا۔ اب نا صرف شہر کا حصہ بن چکا ہے بلکہ قلب شہر میں آ گیا ہے۔ یعنی آبادی بڑھتے بڑھتے شہر پھیلنے پھیلنے کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے۔ کراچی کی ایک سمت میں نہیں پھیلا بلکہ اس میں دو طرفہ اضافہ ہوا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کراچی میں چار پانچ منزلہ چند ہی عمارتیں ہوا کرتی تھیں۔ بولٹن مارکیٹ کی ایک عمارت سب سے بلند تھی جو غالباً چار پانچ منزلہ تھی اور اس پر گھنٹہ گھر بنانا ہونے کے باعث اس کی بلندی سب سے زیادہ مانی جاتی تھی۔ پھر چل سوجھل شہر چو طرف کے ساتھ ساتھ بلندی میں بھی بڑھنے لگا یوں شہر کراچی کو پانی

کی فراہمی اور گندے پانی کی نکاسی کے مسئلے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی ویسے ویسے وسائل نقل و حمل میں بھی اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ تبدیلی بھی آ گئی۔ یعنی گدھا گاڑی اونٹ گاڑی کی جگہ ٹرکوں اور مٹی ٹرکوں نے لی۔ یعنی ٹریفک کے اثر و رسوخ میں غیر معمولی اضافہ ہوتا چلا گیا اور شہر کی آبادی کے ساتھ ہر قسم کی ٹرانسپورٹ میں بھی اضافہ ہوا لیکن سڑکیں وہیں کی وہیں رہیں۔ ٹریفک کنٹرول کرنے کے لیے سڑکوں کو چوڑا کشادہ کرنے کی جگہ ٹرام اور بگیوں کو ختم کر دیا گیا۔ تاکہ بھی اب عام نہیں رہے کسی علاقے میں بہ صد بھجوری چل رہے ہیں۔

۱۹۶۰ تک نہ آبادی کا دباؤ کراچی پر اس قدر تھا نہ ہی ٹریفک کا بہاؤ ایسا شدید تھا۔ ایوب خان کے مارشل لا میں کراچی کے ارد گرد نئی بستیوں کو بسایا جانے لگا۔ ان ہی میں کچی بستیاں بھی بسنے لگیں اکثر رہائشی علاقوں کو کسر علاقوں میں تبدیل کر دیا گیا اس کی وجہ سے بھی پارکنگ کے مسائل نے جنم لیا سڑکیں کم کشادہ یا تنگ تھیں۔ ان پر بھی دو طرفہ پارکنگ ہونے سے سڑکیں مزید تنگ ہو کر رہ گئیں جس کی وجہ سے ٹریفک کی روانی رکنے لگی۔ اس میں سب سے بڑی خرابی اس وقت شروع ہوئی جب کثیر المیزان شاہینک سینٹر اور فلیٹوں کے جنگل کے جنگل تعمیر ہونا شروع ہوئے۔ ان فلیٹوں کی تعمیر میں سب سے بڑی خرابی کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کا حکم نہ کیا جاسکتا ہے۔ جنہوں نے نقشے تو پاس کیے لیکن تعمیر کی نگرانی نہیں کی یا بے پروائی کے باعث کثیر المیزان فلیٹوں میں پارکنگ لاٹ کا انتہام نہیں کیا۔ اب جگہ جگہ ہر قسم کی گاڑیاں پارک کی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے سڑکوں کی کشادگی نصف ہو کر رہ گئی ہے۔ دوسری خرابی سڑکوں کی ناقص تعمیر اور مرمت کا نہ ہونا ہے جس کے باعث گاڑیوں کی رفتار ختم ہو جاتی ہے۔ جو ٹریفک جام ہونے کا سبب بنتی ہیں اس کے علاوہ گندے پانی کے ناقص نظام کے باعث جگہ جگہ ٹرانسپورٹ رہتے ہیں اور سڑکوں پر گندہ پانی جمع ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی ٹریفک کا نظام درہم برہم ہوتا ہے۔ بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کی ناقص منصوبہ بندی بلکہ کارکردگی کے باعث بہت سارے شاہینک پلازے اور کمرشل عمارتیں بغیر پارکنگ لاٹ کے خلاف قانون تعمیر کی گئی ہیں اور جہاں کہیں انڈر گراؤنڈ پارکنگ لاٹ بنائی بھی گئی وہاں پارکنگ کے بجائے مال گودام بنادے گئے ہیں۔ سب سے اہم بات کراچی ٹریفک پولیس کی ناقص کارکردگی اور بدعنوانی، رشوت ستانی، بے پروائی بھی ٹریفک جام ہونے کا سبب ہے۔ کراچی کی اہم شاہراہیں مثلاً ایم اے جناح روڈ، شاہراہ شاہ فیصل، شاہراہ قائدین، یونیورسٹی روڈ، نیپا چورنگی، راشد منہاس روڈ، گولی مار، لیاقت آباد، فیڈرل بی ایریا اور اب تو انڈر پاسز ز اور فلائی اوور بن جانے کے باوجود ٹریفک جام رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو اپنے دفاتر طلبہ کو اپنے کالج اسکول اور مریضوں کو اسپتال جانے میں جس دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں لگا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے ہے کہ ہمارے شہری نظام چلانے والے ادارے دیانت داری اور اخلاص سے کراچی شہر کے لیے منصوبہ سازی نہیں کرتے آج اگر ایک ادارہ سڑک تعمیر کر رہا ہوتا ہے یا کر چکا ہوتا ہے تو دوسرے دن دوسرا کوئی ادارہ بجلی، گیس، پانی اور گٹر کی ٹیلی فون کی لائنیں ڈالنے کے لیے نو تعمیر سڑک کھود کر ڈال جاتا ہے۔ جو ٹریفک میں رکاوٹ ڈالنے کا باعث بنتی ہے۔ اللہ ہمارے شہری تعمیری منصوبہ سازوں کو حب الوطنی سے نوازے اور ذوال مفادات و اغراض سے بلندی عطا فرمائے تاکہ پوری طرح احساس کرتے ہوئے کراچی شہر کے موجودہ مسائل کو حل کر سکیں آمین۔





# گفتگو

عمران احمد

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی بیوہ یا کسی مسکین حاجت مند کے لیے مدد اور تعاون اور کوشش کرنے والا بندہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر و ثواب میں راہ خدا میں جہاد کرنے والے بندے کی طرح ہے۔“ (بخاری و مسلم)

عزیزانِ مضمر..... سلامت باشند!

تمام قارئین کو ماہِ صیام مبارک ہو۔

جس وقت ہم گفتگو کی یہ سطریں تحریر کر رہے ہیں، رویت ہلالِ کینی چاند کو آسمان کی وسعتوں میں تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ حالانکہ سائنس کے اس جدید دور میں چاند کی پیدائش اور اس کے ساتھ کے بارے میں معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں رہا۔ پھر بھی نجانے کیوں ہماری حکومت اور علماء جدید سائنس سے مدد نہیں لیتی۔ جب دین میں کہا گیا ہے کہ علم تمہارا کھوپڑا ہوا اوٹ ہے اسے جہاں پاؤ پکڑ لو مگر ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق آگے بڑھنے کے بجائے جاہلیت کی سمت جا رہے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے۔ دورِ جاہلیت میں چاند نظر آتے ہی کفار اپنے ہتھیار میناؤں میں رکھ لیتے تھے ہر قسم کا لڑائی جھگڑا موخر کر دیتے تھے یعنی اسلام سے قبل بھی یہ مہینہ مقدس تھا لیکن آج کے مسلمانوں نے اس کے تقدس کو ختم کر دیا ہے۔ مصر ہو یا شام عراق ہو یا پاکستان خود مسلمان کے ہاتھوں مسلمان قتل ہو رہا ہے۔ گھر کے گھر اجڑ رہے ہیں۔ بچے یتیم ہو رہے ہیں۔ خونِ انسان پانی کی طر سڑکوں پر بہہ رہا ہے۔ اس کے باوجود ہم خود کو اللہ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت قرار دے رہے ہیں اور خود کو نیک پارسا اور مومن قرار دیتے ہیں، شاید اسی لیے حضرت بابا بلھے شاہ نے فرمایا (ترجمہ) تو نے کتابیں پڑھ کر اپنا نام قاضی رکھ لیا۔ نمازیں پڑھ کر نام نمازی رکھ لیا۔ خنجر اٹھا کر غازی بن گیا، مکہ مدینہ جا کر حاجی بن گیا۔ مگر کیا تو نے اپنے رب کو بھی راضی کیا ہے؟ یہ مہینہ تو کیسے نفس کا مہینہ ہے۔ اپنے نفس کو مسلمان کرنے کا مہینہ ہے۔ اس کا پہلا درس رب کو راضی کرنا ہے اور رب اس وقت تک راضی نہیں ہوتا جب تک اس کی مخلوق راضی نہیں ہوتی۔ آپ لاکھ نمازی حاجی اور قاضی بن جائیں لیکن اگر آپ کی ذات سے آپ کے عمل سے آپ کے پڑوسی عزیز رشتہ دار خوش اور مطمئن نہیں ہوں گے آپ کا رب راضی نہیں ہوگا۔ سو عام حالات خصوصاً اس ماہ میں کوشش کریں کہ آپ کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔ کسی کو آپ کے کسی عمل سے اذیت نہ پہنچے، اگر آپ نے اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا کر لیں تو سمجھیں آپ نے اپنے رب کو راضی کر لیا۔

شہناز بانو..... کراچی۔

محترم عمران بھائی! السلام علیکم اور دعائیں۔ آج جس وقت میں یہ طور پر تحریر کر رہی ہوں شعبان کی پندرہویں شب ہے۔ سو اپنے ساتھ ساتھ اپنے تمام قارئین نے افقِ دوستِ ساتھی اور عمران بھائی مع اہل خانہ سب کے لیے خصوصی دعا گو ہوں کہ اللہ پاک ہم سب کے گناہوں کو معاف کرے۔ ہمیں جہنم سے نجات لکھ دے۔ ہمارے رزقِ حلال میں برکت عطا فرمائے۔ آل و اولاد کی خیریت اور سلامتی کی ڈھیروں دعائیں ہیں۔ امید ہے آپ سب نے مجھ حقیر و ناچیز کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا ہوگا۔ اللہ پاک سب کی دعائیں قبول فرمائے۔ آمین۔ زیادہ مانگ نہیں ہے اس لیے جلدی میں خط لکھ رہی ہوں۔ ابھی نئے افق کا مکمل مطالعہ نہیں ہوا ہے۔ سوائے سلسلہ وار ناول لکھنے کے چپاری کے اس کا اختتام ہوا اور اچھا ہوا۔ میں بھی ان شاء اللہ سندھ ماہِ گردش کی آخری قطع تحریر کروں گی۔ اب دیکھتے ہیں عمران بھائی ہمارے لیے کون سے بہترین ناولز لاتے ہیں۔ امجد جاوید صاحب میں گردش سے فارغ ہو جاؤں تو تسلی سے آپ کا ناول پڑھوں گی اور اس پر سیر حاصل تبصرہ کروں گی۔ آپ بے فکر ہیں۔ میں تنقید بھی خوب کرتی ہوں۔ سوچ لیں تبصرے کی دعوت آپ ہی دے

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نئے افق 10 اگست 2013

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نئے افق 11 اگست 2013

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

رہے ہیں۔ ریحانہ تمہیں اچا رہتی بنانے کا بہت شوق ہے اور مجھے کھانے کا بس خفاش بنا کر بھیج دو اور ہمارے دماغ کی چٹنی..... بابا بابا..... محمد سلیم اختر صاحب آپ کی آمد اچھی لگی۔ آپ سے واقفیت تو بہت پرانی ہے جب ہم بھی بچی کہانیاں میں لکھا کرتے تھے۔ آپ کو گردش پر بند آرہی ہے بہت شکریہ۔ آپ جیسے مجھے ہوئے رائز کی تعریف ہمارا ڈھیروں حوصلہ بڑھا دیتی ہے۔ بھائی ریاض بٹ آپ سے واقفیت بھی پرانی ہے۔ بھینا وہیں سے جہاں سے سلیم اختر صاحب سے ہے۔ پہلے میں وہاں کہانیاں لکھا کرتی تھی لیکن اب میرا وہاں سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اس لیے وہاں لکھنے کا پانکٹ کر دیا ہے۔ یہ آپ سب کی حوصلہ افزائی تھی کہ میں گردش لکھ سکوں۔ اب مصروفیات بڑھ گئی ہیں اس لیے اس کو ختم کر رہی ہوں۔ میں نے قرآنی درس و تدریس کا مدرسہ کھول لیا ہے۔ چھوٹی بڑی لڑکیاں اور خواتین میرے مدرسے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو مجھے قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ پچھلے دنوں این شاہین اپنی والدہ کے ساتھ میرے گھر تشریف لائیں مگر بہت خوش ہوئی۔ ان کی اور ان کی والدہ کی ڈھیر ساری محبتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ وہ بھی نئی زندگی میں قدم رکھنے والی ہیں۔ میں نے گنگے لگا کر تو ڈھیروں دعائیں دی ہیں اب بھی دعا گو ہوں۔ سدا خوش رہو۔ شجاع جعفری تمہارا تہرہ اچھا تھا۔ بھائی جاوید صدیقی آپ کیسے ہیں گردش کی پسندیدگی پڑھیں سارا شکریہ۔ اس مرتبہ عبداللہ شاہد غیر حاضر رہے۔ بھیا جی خیریت سے تو ہو۔ تمہاری غیر حاضری اچھی نہیں لگی۔ لو بچی ناز سلسلہ ڈنٹے بھی کل یعنی 23 جون کو پاپا دیس سدھا رنگیں۔ نازش میری ڈھیر ساری دعائیں تمہارے لیے ہیں۔ ابھی تمہارے ویس میں شریک کرتی ہے۔ اللہ کرے کہ راجی کے حالات اچھے ہیں۔ یہاں تو صبح و شام کا کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا۔ بھائی فقیر لنگاہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ نئے افق نے واقعی بہترین ساتھی عطا کیے ہیں۔ بہنوں کی دعاؤں پر بھائی شکریہ ادا نہیں کرتے۔ بلکہ جواباً خود بھی ڈھیروں دعائیں دیتے ہیں۔ سو تمام ساتھیوں سے دعاؤں کی طالب ہوں۔ نئے افق میں اسعد بھی زور و شور سے واپس آگئے ہیں۔ ان کے لیے بھی دعا کریں کہ اللہ اسے بھی زندگی کی ساتھی نیک عطا کرے۔ نئے افق کا مطالعہ باقی ہے اس لیے کہانیاں پر تبصرہ نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے معذرت اگلا ماہ رمضان المبارک کا ہے پھر عید ہے۔ ان شاء اللہ عید کے بعد ہی ملاقات ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ خوشیوں کے ساتھ ملائے باقی تمام حاضر اور غیر حاضر ساتھیوں کو بہت پیارا اور دعائیں۔ والسلام

عالیہ انعام الہی..... کراچی۔

محترم عمران بھائی! السلام علیکم! بعد از سلام آپ کی ترقی اور ادارے کے بھلنے بھولنے کی خواہشات اور ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ خط کی ابتدا کرتی ہوں۔ آپ جس طرح محنت سے نئے افق کو بھیجی تک ہماری زندگیوں میں شامل کیے ہوئے ہیں بے شک آپ داد کے مستحق ہیں۔ اللہ ہمارے اس طویل ساتھ کو مزید طویل اور خوش آئند بنائے، آمین۔ اس ماہ کا سرورق نگاہوں کو خود میں پیوست کیے رہنے میں کامیاب رہا ہے۔ یوں لگا کہ جیسے زندگی کو رنگوں کی زبان میں بیان کر دیا گیا ہو کہ زندگی آکھ سے چھلکتے ہوئے آنسو میں بھی ہوتی ہے۔ بڑے باہمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو آنسوؤں کو حقیر قطرہ ہرگز نہیں بننے دیتے بلکہ سمندر میں تیرتی طاقت ور اور خوبصورت مچھلیوں کے مشابہہ بنا دیتے ہیں۔ افق پر تیرتی گھٹی بڑھتی شگفتگی لالی حسن زیست کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ پرواز بھرتے رقص کرتے ہوئے خواہشوں کے طوطے زندگی کے وجود کا احساس بن جاتے ہیں۔ فضا کو جانی اور رنگین بناتی ہوئی نازک نازک سی تینیاں زندگی کا کتنا بڑا شاہکار بن جاتی ہیں۔ جمیل کا شفاف موتیوں کی طرح دمکتا ہوا پانی زندگی کی پاکیزگی کا نگار بن جاتا ہے۔ فضا میں جو سوتے شجر زندگی کے غم و استعجال کا استعارہ ہوتے ہیں اور ان پر ایسا کرتے رنگوں سے سچے حسین پرندے ہر لحظہ زندگی کی خوبصورتی کا پیغام بن جاتے ہیں۔ اتنا سب کچھ بس ایک نگاہ میں بصورت تصویر مقید کر دینا کمال کی بات ہے۔ ”دستک“ میں مشتاق انکل حکومت وقت کے ہاتھوں ایک عظیم اور پاکیزہ فریضے کی ادائیگی کو وقت طلب بنا دیے جانے کا بڑا خوب اور بھرپور فاعلی احاطہ کیے بیٹھے تھے۔ مشتاق انکل کا قلم سمجھیں تو ہر ماہ اس نیت سے شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات کے جذبے کے ساتھ جس طرح مصروف عمل ہوتا ہے لگتا ہے کہ ایک قلمی جہاد ہے جس کا اجرا نہیں ضرور ملے گا۔ گفتگو میں شہناز بی بی کی محبتیں اور ان کے وجود سے بھرتی خلوص کی خوشبو سے بھر پور نظر آئیں۔ آنجا آپ اپنی اُسی محبت بھری دعاؤں کا سلسلہ ہمارے لیے طویل کر دیں کہ ہمیں ان کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ آپ کی تکلیف کا پڑھ کر



بڑی تکلیف ہوئی اللہ آپ کو صحت کامل عطا فرمائے آمین۔ آپ کی بزرگانہ شفقت اور محبت ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ شہنی کا کھلکھلاتا اور خوش خبری سے بھرپور خط دل کو خوشی سے بھر گیا۔ اللہ ان کو قائم و دائم خوشیوں سے نوازے وہ صدایوں کی مسکراتی رہیں آمین۔ امجد جاوید صاحب میرے نزدیک تو اپنے زور قلم سے ذوق کے بحر ظلمات میں یقیناً کامیابی کے گھوڑے دوڑائے میں کامیاب رہیں گے اگر جو کہیں لڑکھڑائے بھی توبہ سواری کا تم بھی انہی کے حصے میں آئے گا۔ قارئین کا قسط وار سلسلے کے حوالے سے رویے کا ان کا تجربہ میرے لیے تو بالکل درست ہے کہ میں واقعی کوئی وقت کو بہانہ بنا کر گریز مطالعہ پر اتر آتی ہوں۔ اپنی تحریر کے حوالے سے رائے کی طلب ان کی اپنے قلم سے اور پڑھنے والوں سے خلوص اور ایمانداری کا احساس دلا رہی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو کامیاب و کامران کرے آمین۔ قادری صاحب نے میرے تبصرے کو اہم جاننا اور ان کی محبت اور بڑا پنا ہے ورنہ میں کس لائق ہوں۔ بخش انگلی سانی سادگی اور بے لوث محبت بھری شخصیت کا احساس دلاتے ہوئے موجود تھے۔ انکل آپ کے وجود کی رعنائی ہی آپ کا ہر بناوٹ سے عاری ہونا ہے۔ بس میرے لیے محبت بھری دعائیں کرتے رہا کریں ہم سب کو دعاؤں کی بہت زیادہ ضرورت رہتی ہے۔ سرور شاد بھائی صاحب آخر تک غریب حاضر ہیں گے۔ نہ کوئی خط نہ کوئی تحریر یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا۔ تازش کی غیر حاضری بھی تشویشناک ہے۔ عبداللہ شاہد بھی فکر مند کر گئے ہیں۔ بہت سارے لوگوں کے نام جو غیر حاضر ہیں معافی چاہتی ہوں مجھے یاد نہیں آ رہے کہ گھر کی شفٹنگ کے طویل اور تھکا دینے والے عمل نے مجھے میرا اپنا آپ تک بھلا دیا ہے۔ دعا کریں کہ سب کچھ ہمارے حق میں اللہ اچھا کرے۔ ”اقرأ“ میں اولین دوزخیوں کے بارے میں احادیث کا ذکر تھا جس نے ہمیں رلا دیا کہ ہم تو انتہائی گناہ گار بندے ہیں۔ ہماری بخشش نبی کے امتی ہونے کے باعث تو ہو سکے گی ورنہ ہم تو کسی لائق نہیں ہیں۔ ”فلا دی لڑکی“ انجم فاروق ساعلی کی محنت اور کوشش کا سرچشمہ تھی جس میں نوا موزی کی جھلک دکھائی دیتی رہی۔ کوشش تو شاندار تھی مگر بھیا پر معذرت کے ساتھ کچھ تاخیر دینا چاہوں گی کہ جب میں نے شعور میں قدم رکھا تو امی کی الماری کی چھت پر جہاں میرا ہاتھ بھی مشکل سے پہنچا کرتا تھا نئے افق رکھا ہوتا تھا میں نیل پر چڑھ کر اتارا کرتی اور پڑھتی تھی۔ ابن صفی کی عمران سیریز تب مجھے کسی انتہائی انوکھی دنیا میں لے جایا کرتی تھی جس کا احساس اور شعور آج بھی میرے لیے اثاثہ ہے۔ جب مشتاق انکل مغرب سے برآمد بہترین ادب کے تراجم شائع کیا کرتے تھے۔ اگلا کاشی سنڈلی شیڈن جیسے رائٹرز کے ترجمے انہوں نے شائع کیے جب ذوق کی آبیاری ایسے خطوط پر ہوئی ہو تو پھر آپ کی تحریر کو میں شاندار کوشش کہوں گی۔ بہت سے جھول سپنس سے عاری ایکشن ہوتے ہوئے ایکشن کا نہ ہونا لفظی کے ذریعے احساسات کا بیان واقعات وقوع پذیر نہ ہوں بلکہ واقعات بنائے جانے کی تفریق کی سمجھ کا فقدان بھی تحریر کو شکار بنانے میں مانع رہتا ہے۔ مغرب والے ہر معاملے میں ہم سے بہت آگے ہیں ہمارے ساتھ تو بہت سی سابی اخلاقی اور روایتی پابندیاں ہیں کہ ہمارے ذرائع ابلاغ ابھی مکمل طور پر یہ باغ نہیں ہو سکا ہے۔ بہت سے جذبات کے اظہار سے ہم کتر کر لگتے ہیں یا بھونڈے پن سے چھو کر نکل جاتے ہیں۔ ہماری معاشرتی تربیت ہمیں قلم سے انصاف نہیں کرنے دیتی۔ کھل کر نہ لکھنے کی یہ تربیت ہمیں کسی بھی قلمی شاہکار کی تکمیل سے باز رکھتی ہے۔ میرے خیال میں کچھ زیادہ یہی لگتی کہ ہوں برا لگا ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ کیونکہ میں خود کو اس قابل سمجھتی نہیں پاتی کہ آپ کی محنت کو رد کر دوں اور تعریف کے لیے بھی آدہ نہیں ہو پا رہی۔ ”حق“ نا حق سے ہماری کا مظاہرہ کرنے والوں کے لیے سبق تھی۔ ”قول محبوب“ ایک خوب صورت متاثر کن تحریر تھی۔ شہزادی کے اطوار اور ریتلر کے احساسات کا انتہائی شاندار نقشہ کھینچا گیا۔ نصیحت عام سے موضوع اور اخباروں میں شائع ہونے والی عام خبروں پر بنی عام تحریر تھی۔ ”مقام عبرت“ روکتے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھی۔ اللہ ہمیں ایسی ہر لغزش اور ایسے ہر گناہ سے دور رکھے آمین۔ ”وجود محبت“ محبت کے لطیف و شگفتہ مضبوط توانا۔ انوکھے اور ماوراجذہ کے کا خوب صورت بیان تھی۔ اگر ساری دنیا جی محبت کی آماجگاہ بن جائے نفرت ناپید ہو جائے تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔ کہانی کافی پر تاثیر تھی۔ حالانکہ رومانوی موضوعات مجھے ذرا کم ہی پسند آتے ہیں لیکن یہ تحریر عام رومانس سے ہٹ کر بہت خوب صورت رہی۔ مگر مجھے یہ کہانی گردشِ جوشہناز آتی نے تحریر کی تھی اس میں شاہزب کے ساتھ کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی تھی ہو سکتا ہے کہ یہ مماثلت اتفاقاً ہو جس تحریر کی انگلیز می کوئلہ نظر

رکھتے ہوئے اسے چربہ بالکل نہیں کہہ سکتی۔ ”تمناش بین“ ریاض بٹ صاحب کی ایک اور پیش قیمت تحریر تھی۔ جس سے عقل مندی کے تمام تقاضے پورے ہوتے دکھائی دیے۔ امجد جاوید کی ”قلندر ذات“ میں قسط پڑھ رہی ہوں حالانکہ کئی سلسلے وار کہانیاں میں نے وقت پر پڑھی ہی نہیں۔ حتیٰ کہ شہناز آبی کی شہرہ آفاق تحریریں بھی میں خاصے کی چیز جان کر سب سے پہلے پڑھتی ہوں اور تیرک کی طرح مطالعہ کرتی ہوں کہ ختم نہ ہو جائے مگر امجد صاحب کی تحریریں کچھ ایسی کشش ہے کہ دل پڑھتے رہتے کو مائل رہتا ہے۔ واقعات کا تسلسل زبردست ہے۔ دو مختلف کہانیاں ایک ساتھ بڑی خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ ”بے بسی“ ناظم بخاری کی ایسی تحریر تھی جس نے آنکھوں کو جل نکل کر دیال پر کرب وادبیت کے ایسے کوڑے لگے کہ قلب کی ہر دھڑکن ایک گناہ محسوس ہونے لگی۔ اللہ ہم کبھی کے معاشرے کا حصہ ہیں۔ جہاں کروار اخلاق کا جنازہ نکل چکا ہو۔ ایسے معاشرے قبرستان کی صورت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جسے جی کا ایک سمندر ہے جہاں اٹھنے والے ناروا طوفانوں سے ہم بحیثیت انسان بھی ابل رہتے ہیں اپنے کردار کی ادائیگی کو تو ہم کیا سمجھیں کہ ابھی تو ادارہ کی منزل سے بھی کافی دور ہیں۔ اسد علی بہت عرصے کے بعد بڑے بھرپور انداز سے وارد ہوئے ہیں۔ ”تاریک تنہائی“ موبائل فون کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ اخلاقی اقتدار کا حقیقی اور پرتندرا حاطہ تھی۔ میں اپنی سوچ فکر کے حوالے سے نچانے کیوں کبھی خود کو ان الیکٹرانک رابطوں کے لیے تیار نہیں کر پائی مجھے نیلیفون یا موبائل فون الہجری ہی رہی ہے۔ رانگ نمبروں پر گفتگو میرے نزدیک ہمیشہ ایک مکروہ عمل رہا ہے۔ عمران بھائی اے جمید کی لڑکا چواری تو اختتام پذیر ہو گئی۔ اب بنا کسی وقفے کے اے جمید کی کوئی اور تحریر بھی منافات شائع کر دیں۔ آخر کو ہمیں زندہ بھی رہنا ہے۔ خوشبو خن میں عبداللہ بھائی نے میدان مار لیا ہے اور سیا کاش بخاری صاحب کہاں جا چھپے ہیں ذرا کان سے پکڑ کر انہیں لے کر تو آئیں۔ ان کی تحریریں تو قیامت ہوتی ہیں۔ تعلق بنا کر ردور چلے جانا کوئی اچھی بات تو نہیں۔ عمران بھائی خط بہت طویل ہو گیا ہے اجازت دیں اللہ حافظ۔

**ریاض بٹ** ..... **حسن ابدال**۔ السلام علیکم اہل ماہ جولائی 2013 کا شمارہ خلاف توقع 23 جون کو ہی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ منفرد و ذوق لیے شمارہ بک اسٹال پر سب رسالوں سے سندر نظر آ رہا تھا۔ فہرست پر نگاہ ڈالی تو اپنی کہانی موجود تھی۔ بہت شکر یہ عمران بھائی مشتاق احمد قریشی صاحب طاہر قریشی صاحب اور دیگر قارئین نے افق کے اسلاف کا کہ وہ میری تحریروں کو پذیرائی بخشے ہیں۔ آپ لوگوں اور تمام قارئین نے افق کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں نے ایک سنگ میل عبور کیا ہے۔ کون سا سنگ میل عبور کیا ہے۔ یہ بات میں نہیں بتاؤں گا۔ آپ اندازہ لگائیے اور اپنے آئندہ خطوط میں لکھ دیجئے۔ اب بڑھتے ہیں اپنی محفل گفتگو کی طرف۔ سب سے پہلا خط بہن شہناز بانو کا ہے۔ حسب معمول بڑا دل اور بہترین خط ہے۔ بہن یہ جان کر دکھ ہوا کہ آپ کے مہروں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ خدا آپ کو صحت کامل عطا فرمائے آمین۔ آپ اسی طرح ہستی رہیں۔ ”گردش“ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ شروذ کی جدوجہد مجھے پسند آ رہی ہے اور کہانی ذرا تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ شہنی ارشاد بہن لگتا ہے آپ غصے کی بہت تیز ہیں۔ ذرا ہاتھ ہولار کھا کریں۔ ریحانہ سعیدہ بہن واقعی یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہم ایسی طاقت ہونے کے باوجود گویا پتھر کے دور میں رہ رہے ہیں۔ اب تو ہمارے دشمن (انڈیا) کے جینو بھی ہمارے اوپر طنز کر رہے ہیں۔ محمد سلیم اختر صاحب۔ میری کہانیاں پسند کرنے کا بے حد شکر ہے۔ میری کہانیاں ہمارے ارد گرد کھری ہوئی کہانیاں ہیں۔ این شاہین بہن خدا آپ کو کبھی صحت کامل عطا فرمائے آمین۔ آپ نے بالکل سچ کہا کہ بچھڑ کر جینے کے بھی انداز ہوتے ہیں۔ شجاع جعفری صاحب یاد آوری کا شکر ہے۔ اب تو ہر طرف دہشت گردی کا راج ہے۔ خدا ہمارے ملک کا حامی و ناصر ہو اور دشمنوں کے ناپاک عزائم خاک میں مل جائیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب بھائی کیا حال چال ہیں۔ آپ درمیان میں بہت غیر حاضریاں کرتے ہیں۔ اس بار آپ نے مجھے بالکل نظر انداز کر دیا۔ کیا بات ہے؟ کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ فقیر محمد بخش ساہر لڑگاہ صاحب اس بار آپ پر تازہ لگتے ہیں میری دعا ہے آپ ہمیشہ خوش و خرم رہیں۔ میرا خط لکھی تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکر ہے۔ اس بار میری کہانی تمناش بین موجود ہے اس کے متعلق ضرور بتائیے گا۔ اب بڑھتے ہیں کہانیاں کی طرف۔ سب سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کر دوں کہ اس بار کافی کہانیوں کے ساتھ رائٹز کا نام نہیں تھا۔ صرف فہرست سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہ کہانی کس نے لکھی











### ترتیب: طاہر قریشی

اعمالِ صالحہ کی وجہ سے لوگوں میں اچھی شہرت اللہ کی ایک نعمت ہے:-  
(۲۶۰)

(ترجمہ) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا ارشاد ہے ایسے شخص کے بارے میں جو کوئی اچھا عمل کرتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں؟..... اور ایک روایت میں ہے کہ پوچھنے والے نے یوں عرض کیا کہ کیا ارشاد ہے ایسے شخص کے بارے میں جو کوئی اچھا عمل کرتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں؟..... آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔ یہ تو مومن بندہ کی نعمت بشارت ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) ریا اور شہرت طلبی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ بالا اہم کے ارشادات نے صحابہ کرام کو اتنا ڈرا دیا تھا کہ ان میں سے بعض کو یہ شبہ ہونے لگا کہ جس نیک عمل پر دنیا کے لوگ عمل کرنے والے کی تعریفیں کریں اور اس کی نیکی کا چرچا ہو اور لوگ اس کو اللہ کا نیک بندہ سمجھ کر اس سے محبت کرنے لگیں تو شاید وہ عمل بھی اللہ کے یہاں مقبول نہ ہوگا، کیونکہ اس عمل کرنے والے کو دنیا میں شہرت اور محبت کا صلہ مل ہی گیا..... اسی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا گیا تھا، جس کا جواب میں آپ نے فرمایا۔ ”تلك عاجل بشرى المؤمن“ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی نیک عملی کی شہرت ہو جانا اور لوگوں کا اس کی تعریف یا اس سے محبت کرنا کوئی بری بات نہیں ہے، بلکہ سمجھنا چاہئے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آخرت میں ملنے والے اصل انعام سے پہلے اس دنیا میں نقد صلہ اور اس بندہ کی مقبولیت و محبوبیت کی ایک خوشخبری اور علامت ہے۔

جاری تھی کہ لنگاہ صاحب سے پہلے دکھائی دیا۔ صدیقی صاحب آپ ہمارے محترم ہاذاوق قاری ہیں۔ کہانیوں میں تماشا بین، جسے اہق، قول محبوب، گردش، لنگاہ کا بچاری آخری قسط اچھی تحریریں تھیں۔ اشعار کا انتخاب بھی خوب تھا۔ ریحانہ سعید، شبنمی ارشاد، سعید عبداللہ شاہد، قدیر انار کا انتخاب قابل قدر تھا۔ ذوق آگے بھی میں ماں تحریر متاثر کن تھی روزہ کے متعلق لنگاہ صاحب کے اشعار خوب تھے۔

**اللہ دتہ عابد..... منچن آباد:** السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ احوال آنکدہ جولائی کا شمار اپنے نئے مقررہ وقت 25 جون کو جلولہ گر ہوا۔ مکمل خوب صورت تھا۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کا ادارہ دتک پڑھا۔ پاکستانی انفرشامی کی سن مانی کے بارے میں سن کر انہیں ہوا۔ گفتگو میں عمران احمد جمعی عام دی کی زندگی پر بحث کر رہے ہیں۔ شہناز بانو صاحبہ نے سنائیں کسی ہیں۔ اللہ آپ کو صحت، سلامتی دے۔ شبی ارشاد صاحب اللہ سے دعا ہے کہ اللہ آپ کی یہ ہنسی سدا آپ کے چہرے پر قائم رکھے۔ امجد جاوید صاحب اب تو آپ پرانے ہو گئے ہیں۔ اب ہر ماہ یا کریں۔ ریحانہ سعیدہ صاحبہ سنائیں آپ کے مزاج بخیر ہیں۔ این شاہین نے کہا میں نے خوب تجربہ کیا ہے اچھا کلا! ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب کیا حال ہیں جناب میں ہر ماہ آپ کا تبصرہ پڑھتا ہوں۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب دیکھیں اللہ دتہ عابد کو آپ جیسے مخلص دوستوں کی محبت آخرو دوبارہ لے لی آئی۔ سنائیں آپ کی صحت کیسی ہے۔ میری دعاؤں میں آپ ہمیشہ شامل رہتے ہیں۔ نازولوش ڈشے مجھے آواز دینے اور خواب غفلت سے بے دار کرنے کا شکر می اور اپوار کی مبارک ہو۔ اللہ آپ کو اور ترقی دے۔ عبداللہ شاہد طاہرہ جبین تارا عالیہ انعام الہی ضرور شاہد بھابی زوبیہ شاہد نوید اسماعیل ناصر عبدالکبیر ساجد احمد علی کیف آپ سب جہاں بھی ہوں اللہ سے دعا ہے کہ خیریت سے ہوں اور ہاں بھائی داپس آنے کی بھی کوشش کریں۔ طاہرہ احمد قریشی صاحب نے اقرا میں خوب ایمان تازہ کیا۔ خوشبو سخن میں ریحانہ سعیدہ اور شبنی ارشاد چھائی ہیں۔ عبداللہ شاہد کی غزل خوب تھی۔ اسے حمید کی تحریر کا انجام خوب تھا۔ اسی کے ساتھ اجازت باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ اللہ ہونے والی دانی۔

**شجاع جعفری ..... نلہ گنگ۔** السلام علیکم! بھائی عمران امید ہے کہ آپ کی ساری ٹیم بخیر و عافیت ہوگی۔ 25 تاریخ کو دیار یار نے افق ہوا۔ سردی ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تھا۔ سرسبز پہاڑ جھیل اور ٹوٹے اور بہت خوب صورت منظر تھا۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی کو پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ اقرارہ قریشی کا انتخاب اپنی مثال آپ ہے۔ گنگٹو کی حدیث بہت اچھی تھی۔ سب سے پہلے شہناز بانو ہمیشہ کی طرح جو لکھنے میں اپنی مثال آپ ہیں ان کے بارے میں کیا لکھا جائے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ اس کے بعد شبنی ارشد نے اپنی پھولوں بھری تحریر بھیجی۔ ریحانہ سعید بھی تھیں۔ انہوں نے مکرانوں کی بات کی آپ سے یہ برداشت نہیں ہوتے وہ تو بہت سخت تھے۔ محمد صلیف قادری اور محمد اہلی بھی شامل ہوئے اس کے بعد ریاض بٹ (حسن ابدال) نے اپنی تحریر بھیجی آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ اس کے بعد این شاہین آپنی سے ملاقات ہوئی۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی راولپنڈی سے تشریف لائے۔ فقیر محمد بخش صابر لڑگہ خانہوال سے اپنے مخصوص انداز میں تشریف لائے اور اپنی خوشبو سے محفل کو معطر کر دیا۔ ریاض حسین قمر کہاں ہیں آپ؟ آپ کے بغیر محفل سوئی سوئی سی ہے اور سید عبداللہ شاہد آپ کہاں ہیں۔ کتابیات تمام اچھی تھیں۔ مقام عبرت، تماشا بین، فلاوی لڑکی، گردش اور گنگا ک پجاری بہت اچھی تھیں۔ خوشبو میں تمام شعر کا کلام اچھا تھا۔ بالخصوص ریحانہ سعید، شبنی ارشد کی نظم اور نوخیز اشم کی نظم سید عبداللہ شاہد، محمد اسلم جاوید اور ریاض حسین قمر کی غزلیں اچھی تھیں۔ آخر میں دعا کہ آپ سب خوش رہیں آمین۔



## خورشید پیرزاده

افسانی اقدار اگر تبدیل ہو جائیں تو معاشرہ ایک ایسے جنگل میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں بظاہر انسان رہتے ہیں لیکن ان کی خصلتیں درندوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہیں۔ درندے اس وقت ہی کسی جانور کا شکار کرتے ہیں جب بھوک ان کی ہر حس پر غالب آجاتی ہے، ورنہ عام حالت میں وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے لیکن جب انسان درندہ بن جاتا ہے تو بلاوجہ اپنے جیسے انسان کو بھیڑھوڑنا اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے وہ کوئی جواز تلاش نہیں کرتا۔ جیسا کہ آج ہمارے پورے ملک خصوصاً کراچی کی گلیوں میں ہو رہا ہے۔ وہاں روزانہ شہید زدہ بوری بند لا شیون ملتی ہیں۔ خوہش کار پلانڈ بم دھماکے ہوتے ہیں، جن میں درجنوں معصوم بچے، خواتین، بوڑھے اور جوان ہلاک ہو جاتے ہیں، نہ مارنے والے کو پتا ہوتا ہے کہ وہ کیوں مار رہا ہے، نہ مرنے والے کو کہ اسے کیوں قتل کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ انسان درندہ بن چکا ہے۔ برہنگی خون بہن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔

تھے افق کے قارئین کے لیے خورشیدہ پیرزادہ کی دلچسپ تحریر

سطر سطر تجسس لفظ لفظ ہنگامے ایک طویل ناول

طعنہ دیتا رہتا تھا۔ ہر نئے دن وہ نیا مطالبہ لیے وردا کے سامنے کھڑا ہوجاتا۔ اس کے مطالبے پورے کرتے کرتے وردا کے گھر والے تھک چکے تھے۔ جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو وردا اپنی سسرال یعنی حیدر آباد سے واپس کراچی چلی آئی تھی۔

”اُف آج ٹھنڈ بھی بہت ہے۔ سڑک بھی کتنی سنسان لگ رہی ہے۔ مجھے اتنی دیر آفس میں نہیں رکنا چاہئے تھا۔“

رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ جنوری کی ٹھہرا دینے والی سردی میں اس وقت بھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں رضائی میں دبکے ہوئے تھے۔

دردِ پہلی بار گھر سے اتنی دیر تک باہر رہی تھی۔ کار چلاتے ہوئے بھی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور دل ہی دل میں خیر خیریت سے گھر پہنچ جانے کی دعا کیں مانگ رہی تھی، دن کے وقت جو راستے جانے پہچانے سے لگتے تھے، رات کے اس پہر کی خوفناک

”میم صاحب رات بہت ہو چکی ہے آپ کب تک رہیں گی یہاں۔“ عزیز چاچا نے پوچھا۔  
 ”چاچا جارہی ہوں۔“ وردا نے میز پر بکھرے کاغذات کو ایک فائل کو ریشم سے سمیٹتے ہوئے کہا۔  
 وردا آفس کے چوکیدار کو چاچا کہہ کر ہی بلاتی تھی جیسے ہی وردا اپنے کیبن سے باہر نکلتی آفس کے سنالٹے کو دیکھ کر اس کا ڈر کے مارے ملا سونکھ گیا۔

”اوہ! مٹی دیر ہوئی، پیڑ بھی نہیں چلا، مگر یہ اسائنمنٹ بھی پورا کرنا ضروری تھا ورنہ کل وہ کمینڈر سیر الدین میری جان کھا لیتا، خدا الیہا بس کسی کو بھی نہ دے۔“ ویرا پانکرنگ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

کار میں بیٹھتے ہی اس نے اپنے پایا کو فون کیا۔ ”پاپا“  
 بس آ رہی ہوں بیس منٹ میں گھر پہنچ جاؤں گی۔“

دردِ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی پچھلے پانچ ماہ سے اپنے میکے میں رہ رہی تھی وجہ وہی پرانا رونا تھا اس کا شوہر سلیم بہت کچھ لانے کے باوجود اسے کم جینے کا

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کو ایک دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ اپنے گھر میں نماز پڑھ رہے تھے اسی حال میں ایک شخص آیا اور اس نے ان کو نماز پڑھتا ہوا دیکھا، وہ کہتے ہیں کہ میرے دل میں اس بات سے خوشی پیدا ہوئی کہ اس شخص نے مجھے نماز جیسے اچھے کام میں مشغول پایا۔ انہوں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا (تاکہ خدا نخواستہ اگر یہ بھی ریاکاری کی کوئی شاخ ہو تو اس سے توبہ و استغفار کیا جائے) آپؐ نے ان کو اطمینان دلایا کہ یہ ریا نہیں ہے بلکہ تم کو اس صورت میں خلوت کی نیکی کا بھی ثواب ملے گا اور جلوت کی نیکی کا بھی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو اعمال صالحہ اخلاص کے ساتھ اللہ ہی کے لیے کیے جائیں لیکن عمل کرنے والے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر اللہ کے دوسرے بندوں کو ان کا علم ہو جائے اور پھر اس کو اس سے خوشی ہو تو یہ اخلاص کے منافی نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کوئی نیک عمل اس لیے لوگوں کے سامنے کرتا ہے کہ وہ اس کی اقتدا کریں، اور اس کو سیکھیں تو یہ بھی ریا نہ ہوگا بلکہ اس صورت میں اللہ کے اس بندہ کو تعلیم و تبلیغ کا بھی ثواب ملے گا، بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بہت سے اعمال میں یہ مقصد بھی ملحوظ ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقتِ اخلاص نصیب فرمائے، اپنا مخلص بندہ بنائے اور پادشہ  
جیسے شرک سے ہمارے قلوب کی حفاظت فرمائے۔ اللھمہ امین! (جلد ثانی ختم ہوئی)

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)





















زمین پر چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔

”لائٹ بند کروں یا جلتی رہنے دوں۔“ مراد نے پوچھا۔

”جلنے دو مجھے اندھیرے سے خوف آتا ہے۔“ وردا بولی۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“

ابھی پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کوئی زور زور سے دروازہ کھڑکانے لگا۔ وردا گھبرا گئی کہ کہیں یہ وہی قاتل تو نہیں جو ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا ہو۔

”کون ہے؟“ وردا نے دھیرے سے پوچھا۔  
”شاید کوئی پڑوسی ہوگا“ تم فکر مت کرو میں دروازہ کھولتا ہوں مگر پہلے یہ لائٹ بند کر دیتا ہوں تاکہ جو کوئی بھی ہو نہیں نہ دیکھ سکے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وردا نے اس کے مشورے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

مراد نے دروازہ کھولا اور ایک لڑکا تیزی سے اندر آ گیا۔

”ارے استاد کہاں چلے گئے تھے تم؟ میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔“ اس لڑکے نے کہا۔

”ایک کام سے گیا تھا۔“ مراد نے جواب دیا۔

”ہاں بہت ضروری کام تھا اسے آج۔“ وردا دل میں بولی۔

”ارے استاد تم بھی نا جب بھی میں کوئی جگاڑ لگاتا ہوں تم غائب ہو جاتے ہو اور یہ اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔ لائٹ تو جلا دو۔“

”راجو مجھے ابھی بہت نیند آ رہی ہے کل بات کریں گے ٹھیک ہے نا۔“ مراد نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

”ارے استاد میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں

اور تم کہہ رہے ہو کہ نیند آ رہی ہے۔“  
”ہاں یار، بہت تھک گیا ہوں آج“ تم ابھی جاؤ۔  
کل بات کرتے ہیں نا۔“

”استاد“ راجو زاردارانہ لہجے میں بولا۔ ”نغمہ میرے ساتھ ہے۔“

”نغمہ..... کون نغمہ؟“ مراد نے حیرت سے پوچھا۔  
”وہی مٹو پان والے کی لڑکی جس کے ساتھ تم وقت گزار چکے ہو کچھ باپا؟“ راجو شوخ لہجے میں بولا۔

اور پھر جو اس لڑکی نغمہ کے حوالے سے راجو اور مراد میں باتیں ہوئیں انہیں سن سن کر وردا شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہی تھی اسے مراد پر بھی سخت غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے بھی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ اور وہ راجو وہ تو اسے کوئی بہت ہی سچ قسم کا لڑکا لگا تھا۔ مگر وہ برداشت کر کے چپ چاپ بیٹھی رہی۔

ورنہ کہانی کوئی اور رخ بھی اختیار کر سکتی تھی اور اس راجو کا کیا بھروسہ۔

”مان گئے استاد تم واقعی میں استاد ہو۔“

”اچھا اچھا اب جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے جاؤ مون کر نغمہ کے ساتھ آج یہ نغمہ تم اکیلے ہی سنو۔“ مراد نے اسے ٹھلاتے ہوئے کہا۔

راجو کے جانے کے بعد وردا غصے سے تلملا کر بولی۔ ”تمہیں شرم نہیں آئی میرے سامنے ایسی گندی باتیں کرتے ہوئے۔“

”اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ تم کوئی بچی تو نہیں ہو شادی شدہ عورت ہو۔“ مراد نے بے پرواہی سے کہا۔

”مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ تم مجھ سے ابھی بھی کوئی بدلہ لے رہے ہو نا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے وہ اچانک آ گیا تھا میں تو بس نارمل انداز سے بات کر رہا تھا اس کے ساتھ تاکہ اسے شک نہ ہو کہ کوئی گڑبڑ ہے۔“

”گڑبڑ..... کیسی گڑبڑ؟“ وردا کچھ سمجھتے ہوئے بولی۔  
”یہی کہ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ تم بھی یہاں ہو تو۔“ اتنا کہہ کر مراد خاموش ہو گیا۔

”تو..... بات تو پوری کیا کرو۔“ وردا نے چڑ کر کہا۔  
”تو ظاہر ہے وہ بھی اپنا حصہ مانگتا۔“ مراد نے بات پوری کی۔

”حصہ..... کیا حصہ..... کس بات کا حصہ؟“ وردا اب بھی کچھ نہیں سمجھتی تھی۔

”وہ بھی تمہارا حصہ دار بن جاتا..... اور ہم تو روز ہی ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ہماری لائف میں ایسی باتیں عام زندگی کا حصہ ہیں۔“

”اسے تم عام زندگی کا حصہ کہتے ہو شرم کرو۔“  
”یہاں ایسے ہی چلتا ہے میڈم۔“

”باسٹرڈ“ وردا دانت بھینچے ہوئے بولی۔  
وردا رضائی میں دیکھی بیٹھی تھی۔ ایسی صورت حال میں اسے نیند آنا ناممکن تھا۔ اسے بس جلدی سے صبح ہونے کا انتظار تھا۔

”خدا کرے باقی رات خیریت سے گزر جائے۔“  
نہ جانے صبح صبح کس کا منہ دیکھا تھا۔

”ویسے میڈم نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی ہے۔“  
”کیوں تمہیں کیا ہوا ہے تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ آج تم نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔“

”فریڈ میرا بہت اچھا دوست تھا۔“  
”کون فریڈ.....؟“

”وہی جس نے تمہاری کارروائی تھی۔“ مراد بولا۔  
”اس کے خاندان میں کون کون ہے۔“ وردا نے یونہی وقت گزارنے کے لیے پوچھ لیا۔

”اس کا چھوٹا بھائی اور ماں ہیں اس کے باپ کا تو بہت پہلے انتقال ہو چکا ہے شادی ابھی تک ہوئی نہیں تھی بڑی مشکل سے مانا تھا میرا ساتھ دینے کے لیے

آخر تک مجھے سمجھا تا رہا کہ سوچ لو مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔“  
”مگر تم پر تو مجھ سے بدلہ لینے کا بھوت سوار تھا ہے نا۔“ وردا نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

پتا نہیں پولیس وہاں پہنچی یا نہیں..... پتا نہیں اس کی لاش وہاں سے اٹھائی گئی یا نہیں۔ ٹھیک ہے جو ہوا سو ہوا مگر مجھے فریڈ کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔“

”اور مجھے بس صبح ہونے کا انتظار ہے۔“  
☆☆☆☆

رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور وردا ابھی بھی جاگ رہی تھی۔ دوسری طرف مراد کے خراٹے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔

”کم بخت مجھے مضیبت میں پھنسا کر خود چین سے سو رہا ہے۔“ وردا نے اسے کوستے ہوئے کہا۔ جیسے جیسے رات بیت رہی تھی وردا کے دل کا اطمینان بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ انہی سوچوں میں چار بج چکے تھے مراد ابھی بھی خراٹوں بھری نیند کے مزے لے رہا تھا جبکہ وردا نے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزاری تھی اس نے بھولے سے بھی آنکھ نہ جھپکی تھی یہ اس کے اندر کا خوف تھا شاید کچھ خوف اس کریک قاتل کا اور کچھ خوف اس بات کا کہ کہیں مراد اس کی نیند کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کر لے۔

جیسے ہر برا خواب آخر ختم ہو جاتا ہے ویسے ہی آہستہ آہستہ یہ رات بھی ختم ہو رہی تھی اور اب وردا کی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی پانچ بج رہی تھی۔

”کیا کروں..... گھر کے لیے نکل پڑوں۔“ وردا نے سوچا پھر خود ہی اس خیال کی نفی کرنے لگی۔

”سردیوں کا موسم ہے اور اس وقت بھی سڑکیں بالکل سنسان ہوں گی مجھے چھ بجے تک انتظار کرنا چاہیے۔“

اس وقت شاید کوئی رکشہ عکسی مل جائے جہاں اتنی

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نئی افق 30 اگست 2013

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نئی افق 31 اگست 2013

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نئی افق 30 اگست 2013

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک











دوسری جانب وردا کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا تھا۔

دستک کے جواب میں دروازہ کھلنے پر ایک خوبصورت لڑکی مسکراتی ہوئی اندر آ جاتی ہے۔

”کیا مطلب ہے سر؟“ مسکان حیرت سے  
عید مبارک عید مبارک عید مبارک  
نئے افق 37

”آپ فکر نہ کریں سر۔ کیس تو حل ہو ہی چکا ہے۔“

2013 عید مبارک عید مبارک عید مبارک



آواز کا رعب۔ ریپشنسٹ بیچارے کی تو حالت خراب ہونے لگی۔  
 ”آئیں سر میں خود آپ کو روم تک لے چلتا ہوں۔“

”چل جلدی“ خان نے کہا۔  
کچھ ہی دیر بعد انسپٹر خان سب انسپٹر ملک کے  
ساتھ روم نمبر 305 کے باہر کھڑا تھا۔  
☆☆☆.....

اندر کمرے میں لیپ ٹاپ پر ٹش فلم چل رہی تھی  
اور راجہ نواز بے چاری مکان کے تاثرات دیکھ دیکھ  
کمرے لے رہا تھا۔  
”کچھ سیکھتا تم نے اس فلم سے۔“  
”جی سر۔“

”گلد جتنا جلدی تم یہ سب سیکھ جاؤ گی اتنی ہی جلدی ترقی کرو گی۔“

”میں آپ کا یہ مشورہ یاد رکھوں گی سر۔“

”اسی میں تمہاری کامیابی ہے۔“

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔

”کون آ گیا اس وقت رنگ میں بھنگ ڈالنے

”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے ناسر۔“ مکان نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”فقر مت کرو یہ ہوٹل بالکل محفوظ ہے۔ ضرور کوئی بے وقوف ویٹر ہوگا تم مووی پر دھیان دو میں دیکھتا ہوں کون ہے۔“ راجہ نواز اٹھتے ہوئے بولا۔

عید مبارک عید مبارک عید مبارک **نئے افق 38** اگست 2013ء عید مبارک عید مبارک عید مبارک

”تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟“ خان نے

”ہوں مسکان، ٹھیک ہے مجھے تمہارا روم چیک کرنا ہے۔“ خان نے روم کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن انسپٹر صاحب بتائیے تو سہی کہ بات کیا ہے؟“

جب خان کمرے میں آیا تب تک مسکان اپنے چہرے پر دوپٹہ لپیٹ چکی تھی۔

”سنا نہیں انسپکٹر صاحب نے کیا کہا چلو مکھڑا دکھاؤ اپنا۔“ وحید ملک کو بھی تو کچھ کہنا ہی تھا۔

”جی میں اپنے منگیتر سے ملنے آئی تھی۔“  
انسپیکٹر کا ماتھا اٹھکا اس نے لیب ٹاپ میں جھانک کر دیکھا اس میں ابھی بھی فٹس فلم چل رہی تھی۔

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

”سرمیں نے بتایا کہ وہ میری منگیت ہے۔“  
 ”اچھا، اور کیا کرتی ہے تمہاری یہ منگیت؟“ خان  
 نے ایک اور چہتا ہوا سوال کیا۔  
 ”وہ اب اس فائل میں ہے،“ راجہ نواز نے مکان

”اچھا، چلو یہ بتا دو کہ کہاں رہتی ہے تمہاری یہ  
مگنیترا اس کا ایڈریس تو یاد ہوگا نا تمہیں۔“ خان کے  
لہجے میں طنز بھرا ہوا تھا۔

اس کی بات کا جواب خان نے راجہ نواز کے چہرے پر ایک کراکچھیڑ رسید کرتے ہوئے دیا پھر اتنی زور کا تھا کہ راجہ نواز کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

”کیا کیا“ خان چونک پڑا۔ شاید اسے اس سچ کی امید نہیں تھی۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ شاید ان کا کوئی خفیہ چکر چل رہا ہے۔

2013ء عید مبارک عید مبارک عید مبارک



”سر میں پنڈی سے آیا ہوں۔“

”کب آئے تھے یہاں اس شہر میں۔“ انسپکٹر خان کا تفتیش کرنے کا اپنا الگ ہی انداز تھا۔

”میں رات کی فلائٹ سے آیا ہوں سر۔“

”ملک صاحب۔“ خان نے وحید ملک کو آواز دی کمرے میں موجود تھا۔

”جی سر۔“ ملک فوراً اللہ دین کے جن کی طرح حاضر ہوتے ہوئے بولا۔

”یہ لڑکی تو وہ نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ کمرہ اچھی طرح سے چیک کر لیا تا تم نے کوئی اور تو نہیں ہے نا اندر۔“ خان نے پوچھا۔

”جی سر میں نے کمرہ اچھی طرح چیک کر لیا ہے اس لڑکی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور ہاں سر چیکنگ کرتے ہوئے بیڈ کے نیچے کے نیچے سے یہ ملا۔“

ملک نے ایک بڑا سا چاقو خان کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

”اتنے بڑے چاقو کو نیچے کے نیچے رکھ کر کیا کر رہے تھے تم؟“ خان نے راجہ نواز کو گھورتے ہوئے کہا۔

”جی..... وہ..... میں.....“ راجہ نواز ہکا کر رہ گیا۔

”کیا میں میں لگا رہی ہے بکرے کی اولاد کیا مطلب ہے ایسا چاقو رکھنے کا۔“

”سر میرا نصیب بہت خراب چل رہا ہے۔ ایک بابا نے بتایا کہ گردش اور بندش ہے اسے دور کرنے کے لیے انہوں نے اس چاقو پر کوئی عمل پڑھ کر دیا تھا کہ میں اسے اپنے نیچے کے نیچے رکھا کروں۔“

”چھوٹے موٹے چاقو سے کام نہیں چل سکتا تھا کیا جو اتنا بڑا رکھنے کی ضرورت پیش آگئی۔“ خان ابھی بھی مطمئن نہیں تھا۔

”سر بابا نے یہی دیا تھا میں نے ان کا حکم سمجھ کر رکھ لیا۔“

”ہوں..... ملک جی ذرا ایک منٹ کے لیے ادھر تو آئیں۔“ خان نے ملک کو آواز دی۔

”جی سر۔“ ملک بولا۔

خان نے ملک کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے جا کر بولا۔ ”تم اسے تھانے لے جاؤ اور ڈرا دھماکا کر چھوڑ دینا اور ہاں ایک پیٹی سے کم مت لینا زیادہ تین پانچ کرے تو ڈرائنگ روم کی سیر کر ادینا سارے کو۔“

خان نے ملک کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”سر ایک بات کہوں اگر برائہ مانیں تو۔“ ملک بولا۔

”ہاں ہاں کہو۔“

”جس کالج گرل کا قتل ہوا تھا اسی کی پہلی ہے نایہ لڑکی۔“

”ہاں تم نے ٹھیک پہچانا وہی ہے۔ تم اسے لے کر جاؤ میں ابھی یہیں رکوں گا۔“ خان نے کہا۔

”جی سر سمجھ گیا خوب صورت لڑکی ہے سر تھوڑا ہمارا بھی خیال کر لینا۔“ ملک نے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ سجاتے ہوئے سر ہلادیا۔

”ہاں تو مس سرش صاحبہ تو کیا اب آپ سچ سچ بتائیں گی کہ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔“ خان نے اپنی آواز میں مزید عصب شامل کرتے ہوئے کہا۔

”سر میں نے بتایا نا کہ میں اپنے منگیتر سے ملنے آئی ہوں۔“ سرش یا مسکان نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے کہا۔

”مگر وہ تو آپ کا نام مسکان بتا رہا تھا۔“

”مسکان..... نہیں آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میرا نام تو سرش ہے یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔“

”ہاں ہو سکتا ہے کہ مجھے یعنی انسپکٹر راحت خان کو غلط فہمی ہوگئی ہو۔“

”جی بالکل آپ سے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔“

”مگر وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ تم ایک کالج گرل ہو۔“ خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ اب سرش کے چہرے کا رنگ اڑنے لگا تھا۔

”ہاں اور تمہارے اس منگیتر نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے تمہیں وقت گزارنے کے لیے پچاس ہزار روپے بھی دیے ہیں۔“

”یہ..... یہ سب جھوٹ ہے۔“

”پرس دکھاؤ اپنا۔“ خان اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

”سر پلیز میرا یقین کیجئے آپ تو جانتے ہیں نا کہ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔“

”جانتا ہوں تب ہی تو اتنی نرمی سے پیش آ رہا ہوں ورنہ اب تک وہ ہو جاتا یہاں جو تم سوچ بھی نہیں سکتی تھیں دکھاؤ اپنا پرس۔“ خان دو ٹوک لہجے میں بولا۔

”سر پلیز..... ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔“

اس کی آنکھوں کا دیکھ کر خان نے اس کے ہاتھ سے پرس چھین لیا اور اسے ہول کر پچاس ہزار روپے کی گلدی باہر نکالتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا ہے؟ تمہارے اس حسین بدن کا ایک دن کا کرایہ؟“

”سر مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔“

سرش روہاسی ہوگئی تھی۔

”مجھ سے جھوٹ بھول کر کوئی بچ نہیں سکتا تم کب سے اس دھندے میں ہو۔“

”یہ میرا پہلا اسائنمنٹ ہے سر ابھی بس کچھ دن پہلے ہی جوائن کیا ہے۔“ سرش کی نظریں زمین میں گرہی جا رہی تھیں۔

”کس گروپ کو جوائن کیا ہے تم نے؟“

”مجھے پہلوان کے گروپ کو۔“

”اچھا“ گنج پھلوان..... تو اس کمینے نے نئی چڑیا بھرتی کر لی اور ہمیں بتایا بھی نہیں۔“

”سر..... میں یہ سب چھوڑ دوں گی پلیز مجھے جانے دیں۔“ سرش نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

”ہماری رجسٹریشن فیس تو تمہیں دینی ہی پڑے گی۔“ خان آنکھیں مڑکا تا ہوا بولا۔

”میں بھی نہیں سر۔“

”اس شہر میں جو بھی جرم کی دنیا میں قدم رکھتا ہے اسے ہماری رجسٹریشن فیس دینی ہوتی ہے۔“

”تو ٹھیک ہے آپ یہ پچاس ہزار روپے رکھ لیں۔“ سرش نے اپنی جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔

”ہر جگہ پیسے ہیں چلتا مس سرش صاحبہ۔“

”پھر اور کیا چاہئے آپ کو۔“ سرش کچھ کچھ سمجھ رہی تھی اور کچھ کچھ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”کیسی نا اچھی کی بات کر رہی ہو تم قدرت نے اتنا حسین چہرہ اور اتنا شاندار بدن دیا ہے تم کو یہ کب کام آئے گا۔“ خان اس کے سر پر نظر سیر دوڑاتا ہوا بولا۔

”سر میں اس کام سے آج بلکہ ابھی سے تو یہ کرتی ہوں ویسے بھی میں اپنی خوشی سے اس لائن میں نہیں آئی تھی۔“

”وہ سب میں نہیں جانتا تم نے ابھی قدم تو رکھا ہی ہے نا اس لائن میں تو فیس تو دیو ہو ہی گئی ہے اگر فیس نہیں دینا چاہتیں تو جیل جا کر چکی پیسنے کی تیاری شروع کر دو چو اس تمہاری ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“

”کیا کرنا ہوگا مجھے؟“ سرش نے ہتھیار ڈالنے سے اس دھندے میں ہو۔“

”یہ میرا پہلا اسائنمنٹ ہے سر ابھی بس کچھ دن پہلے ہی جوائن کیا ہے۔“ سرش کی نظریں زمین میں گرہی جا رہی تھیں۔

”کس گروپ کو جوائن کیا ہے تم نے؟“

”مجھے پہلوان کے گروپ کو۔“



”ہوسکتا ہے وہی آدمی اس لڑکی کا مددگار نقاب پوش ہو کیا تمہیں ابھی اس کا چہرہ یاد ہے۔“

”اب تو یادداشت میں اس کا چہرہ کسی قدر دھندلا پڑ

”تمہارے جیسے انپکٹر کے ہوتے ہوئے مجھے کس بات کا ڈر یار۔“  
 ”وہ تو ٹھیک ہے ایک بات سن تیرے لیے ایک بہت شاندار تحفہ ہے میرے پاس۔“  
 ”کیا بات کر رہے ہو یا رگیا ساتھ؟“  
 ”تم ایسا کرو اپنے فارم ہاؤس پر پہنچو ساتھ میں سستی کیے بہت دن ہو گئے ہیں آج خوب مزے کریں گے۔“ خان نے لوفرانڈا ناز میں کہا۔

”کسی بھی پارٹی میں حسین لوگوں کا ساتھ ہو تو پارٹی کی رونق اور بڑھ جاتی ہے تم فکر مت کرو تم بھی خوب انجوائے کرو گی۔“ خان ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں، اُس نے مجھے زبردستی کال گرل بننے پر مجبور کیا ہے اور بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ گتے پہلوان کا باڈی شرے ہے اور اسی طرح لڑکیاں چھنسا کر پہلوان کے گروپ میں شامل کرتا رہتا ہے۔“



”بڑی دلچسپ کہانی ہے۔“ خان ہونٹ سکڑتے ہوئے بولا۔

”یہ کہانی نہیں حقیقت ہے میری جیسی کئی لڑکیاں یونہی محبت کے نام پر برباد ہوئی ہوں گی۔“

”چھوڑو یہ سب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“ خان نے بے پرواہی سے کہا۔

”یہ سب سننے کے بعد بھی آپ مجھے پارٹی میں لے جائیں گے۔“

”بالکل گھوڑا گھاس سے دوتی کرے گا تو کھائے گا کیا“ مگر ہاں تمہارے بوائے فرینڈ کو سیدھا کرنے کی ذمہ داری میری ہے اب خوش۔“ خان

کے چہرے پر گھناؤنی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”ہاں اس سے مجھے کچھ تو راحت ملے گی۔“

”راحت ملے گی نہیں راحت ملے گا اور مل گیا ہے نا تجھے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ سحرش نے حیرت سے کہا۔

”یہ لودیکھو۔“ خان نے اپنے سینے پر لگے ٹیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خود دیکھ لو میرا نام

راحت ہے نا۔۔۔۔۔۔“ خان ہنسے ہی چلا جا رہا تھا۔

”میں اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ سحرش فرماشی لہجے میں بولی۔

”سب ہو جائے گا سحرش صاحبہ تم بس مجھے خوش کر دو میں تمہیں خوش کرتا رہوں گا وعدہ۔“ خان سینے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ سحرش شکستہ لہجے میں بولی۔ ”لیکن یہ خوشی روزانہ تو نہیں دینی ہوگی نا۔“

”اگر تم خود ہی چلی آؤ گی تو میں کہا کہہ سکتا ہوں۔“

مگر میں اپنے بارے میں بتا دوں کہ میں روزانہ نیا شکار پسند کرتا ہوں میری نوکری بھی تو کچھ ایسی ہی ہے نا نیا نیا ملتا ہی رہتا ہے۔“ خان نے اسٹیئرنگ

پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اب ان کی جیب ایک سنان سرک پر دوڑ رہی تھی۔

”یہ تو ہم شہر سے باہر آ گئے ہیں۔“ سحرش نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

”ہم فارم ہاؤس جا رہے ہیں جانو اور فارم ہاؤس تو شہر سے باہر ہی ہوتے ہیں نا۔“ خان نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے پارٹی میں کتنی دیر تک رکھنا پڑے گا۔“ سحرش نے پوچھا۔

”ارے بھئی پارٹی ہے دیر بھی ہو سکتی ہے۔“

.....ہی۔“ خان کے ہونٹوں پر وہی اس کی مکروہ ہنسی تھی۔

کچھ منٹ کے بعد جیب ایک بڑے سے فارم ہاؤس کے مین گیٹ پر آ کر رک گئی۔ پرویز گیٹ پر ہی کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

جیب سے اترتے ہی خان نے پرویز کو گلے سے لگایا اور بولا۔ ”پہی برتھ ڈے یا ڈر انغور سے دیکھ تیری سالگرہ کے لیے کیا پناختہ تھا لایا ہوں تیرے لیے۔“

پرویز نے سحرش کو اوپر سے نیچے گھور کر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی ہنسی ابھرتی جیسے دیکھ کر سحرش نے فوراً اپنی نظریں جھکا لیں۔

”بول نایار کیسا لگا برتھ ڈے گفٹ۔“ خان نے پرویز کا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ کہنے لائق چھوڑا ہے تو نے جو میں بولوں۔“

ایک تو یہ لڑکی ویسے ہی بہت خوبصورت ہے اوپر سے یہ اس کا جوڑی دار سوٹ تم ڈھار ہا ہے ابے لنگور تیرے ہاتھ کیسے لگی یہ حور۔“ پرویز نے ہنستے ہوئے کہا۔

”وہ سب چھوڑو۔ تم آؤ گے کھاؤ گھٹلیاں مت گنو۔“

خان بولا۔

سحرش چپ چاپ سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی اس کے علاوہ وہ اور کچھ بھی کیا سکتی تھی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ پرویز نے سحرش کے پاس آ کر پوچھا۔

”سحرش۔“ وہ سر جھکائے بولی۔

”کیا کرتی ہو؟“

”کان میں پڑھتی ہوں۔“ مختصر سوال کا مختصر جواب تھا۔

”تمہیں اندازہ بھی ہے کہ آج تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟“

”کیا مطلب؟“ سحرش چونکتے ہوئے بولی۔

”ابے پرویز کے بچے چل اندر۔ ڈرامت بچاری کو یہ بازاری لڑکی نہیں ہے سمجھا کر۔“ سحرش کے ڈر کو محسوس کرتے ہوئے خان نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے یار تیری پھر توجہ میں نایاب تحفہ ہے یہ سچ بتانا کہاں لٹی یہ تجھے۔“

”چھوڑو یار یہ سب باتیں یہ بتاؤ سارا انتظام کر لیا ہے کہ نہیں۔“

”سب انتظام پورا ہے کھلی ہوا میں کھلے آسمان کے نیچے کھانا پینا بوتل شٹل پانی دانی سب رکھوا دیا ہے۔“

”اے تو کر سے کہہ دینا کہ دور ہی رہے ہمیں ڈسٹر ب نہ کرے۔“

”یار تم تو جانتے ہی ہو اسے۔ وہ نزدیک پھٹکے گا بھی نہیں۔ ہم تینوں بالکل اکیلے ہوں گے کوئی ڈسٹر ب نہیں کرے گا۔“ یہ کہتے ہوئے پرویز نے سحرش کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

اس بار سحرش نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا اور چونک سی گئی اسے لگا کہ اس نے اس چہرے کو نہیں دیکھا ہے مگر کہاں وہ انہی سوچوں میں ان کے ساتھ چلتی ہوئی فارم ہاؤس کے اندر آ گئی اور یکا یک جیسے اس کے دماغ میں بجلی سی کوندی اسے یاد آ گیا کہ یہی

تو وہ آدمی ہے جو اس دن اس کا اور رضیہ کا پیچھا کر رہا تھا وہ خان کے ساتھ چپک گئی۔

”کیا بات ہے اچھی سے میرا ساتھ اچھا لگنے لگا ہے کیا۔“ خان نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

”سر یہی ہے وہ آدمی۔“ سحرش نے دھیسے لہجے میں کہا جو اس دن میرا اور رضیہ کا پیچھا کر رہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ خان حیرانی سے بولا۔

”مطلب یہ کہ پرویز ہی وہ آدمی ہے۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔“ خان اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی ہے وہ آدمی پرویز ہی تھا۔“ سحرش کا لہجہ کچھ بلند ہو گیا اور احساس ہونے پر اسے افسوس ہونے لگا اپنی بے وفائی پر۔

پرویز جیسے سب سمجھ گیا وہ غصے سے بولا۔ ”سالی طوائف الزام لگاتی ہے مجھ پر۔“

”کوئی بات نہیں پرویز اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تم اپنا غصہ سنبھال کر رکھو وقت آنے پر دل کھول کر نکال لینا۔“ خان نے ہنستے ہوئے کہا۔

”مگر اسے الزام لگانے کا سبق تو ماننا چاہئے۔“

”فکر مت کر ہم اسے ایسا سبق سکھائیں گے کہ ساری زندگی یاد رکھے گی۔“ خان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

لان میں پرویز نے پورا انتظام کر رکھا تھا۔ اس نے تو پورا بیڑ ہی اٹھوا کر گھاس پر رکھوا دیا تھا سحرش دونوں کے درمیان چل رہی تھی۔

”واہری قسمت میرے ایک طرف قاتل ہے اور دوسری طرف پولیس۔“ وہ ہڈیانی کیفیت میں بول رہی تھی پرویز نے اچانک سحرش کو بالوں سے پکڑا اور اسے بیڑ پر بٹخ دیا اور اس کی چیخ نکل پڑی۔



ہیڑ لیتے ہی رمضان جیسے پاگل سا ہو گیا اور  
نئے افق 46

2013 عید مبارک عید مبارک عید مبارک

جس کے لیے یہ اس قافلے کی ایک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

فہم

شعبہ 2013ء عید مبارک عید مبارک عید مبارک











ہیں۔“ نغمہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کی کم علمی پر

”تمہیں شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔“

فقد أفق 53

پر خدا ہو چکی ہوتی۔“ نغمہ نے وردا کے چہرے پر ہریش



چلاتے ہوئے کہا۔

”اوہ ماں گاڈ! یو! ٹو! ج!“ وردا انگلیش میں بڑبڑائی۔

”کیا کہا آپ نے؟“

”کچھ نہیں۔ جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”بس ہو گیا کام اب کچھ ٹائم بالوں کی سینٹنگ

میں لگے گا۔“

”تو جلدی کرو۔“ وردا یہاں سے نکلنے کے لیے

بے چین سی ہو رہی تھی۔

نغمہ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر بول پڑی۔ ”راجو

بہت اچھا ہے۔“

”میں کیا کروں اسے اپنا بالوں جا کر۔“ وردا نے

چڑ کر کہا۔

نہیں نہیں میں نے ایسا تو نہیں کہا۔ آپ ایسا

سوچنا بھی نہیں راجو صرف میرا ہے۔“

”اپنے راجو کو اپنے پاس رکھ۔ مجھے کوئی شوق نہیں

ہے۔“

”میرا خیال ہے مراد آپ کے لیے ٹھیک رہے گا

میں اس سے صرف ایک ہی بار ملی ہوں لیکن ہو سکتا

ہے وہ بھی پیار دینا جانتا ہو۔“

”نہیں ان باتوں کے علاوہ کوئی اور باتیں نہیں

سوچتی کیا؟“ وردا نے تپ کر کہا۔

”مجھے بس اپنے راجو کی فکر ہے اس سے دور ہی رہنا

تم بہت خوبصورت ہو۔ کہیں میرا راجو بہک نہ جائے۔“

نغمہ نے اپنے اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ارے میری ماں میرا تیرے راجو سے کچھ لینا

دینا نہیں ہے اور نہ ہی مراد سے کوئی واسطہ ہے میں

یہاں مجبوری میں پھنسی ہوئی ہوں اور تم ایسی باتیں کر

رہی ہو۔“ وردا نے زچ ہو کر کہا۔

”پھر ٹھیک ہے۔“ اب جسے نغمہ کو اطمینان ہو گیا۔

اس کے بعد نغمہ نے کوئی بات نہیں کی اور چپ

چاپ اپنے کام میں لگی رہی جب کام ختم کر چکی تو

بولی۔ ”لو جی ہو گیا تمہارا حلیہ تبدیل اب تمہیں کوئی

نہیں پہچان سکتا۔“

وردا نے خود کو آئینے میں دیکھا اور نغمہ کے کام کو

سراہتے ہوئے بولی۔ ”بہت خوب خود میں بھی اپنے

آپ کو پہچان نہیں پا رہی ہوں۔“

”ہے نا میرے ہاتھ میں کمال۔“ نغمہ فخریہ لہجے

میں بولی۔

”نغمہ اس سب کے لیے تمہارا بہت بہت شکریہ۔“

”کوئی بات نہیں ویسے معاف کرنا شاید میں

بہت زیادہ بولتی ہوں نا۔“ نغمہ نے بھول پن سے کہا۔

”وہ ٹھیک ہے مگر تمہاری باتیں ہونی بہت گندی

ہیں مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔“

یہ سن کر نغمہ کا چہرہ اتر گیا۔ ”ٹھیک ہے میں چلتی

ہوں میری دعا ہے کہ خدا کو آپ جلد سے جلد اس

مصیبت سے چھٹکارا دلادے۔“

”آمین۔“ وردا نے کہا۔

نغمہ کے جانے کے بعد مراد اور راجو واپس کمرے

میں آگئے مراد نے اچھی طرح سے میک اپ کا جائزہ

لینے کے بعد کہا۔ ”واہ راجو تیری نغمہ نے تو واقعی میں

اس کا حلیہ بدل کر رکھ دیا ہے۔“

”مجھے یقین تھا کہ نغمہ یہ کام کر سکتی ہے۔“ اپنی

محبوب کی تعریف سن کر راجو خوش ہو گیا۔

”پھر اب نکلیں یہاں سے۔“ وردا بولی۔

”ہاں چلتے ہیں۔“

”لیکن پہلے یہ بتا دو کہ کتنی دور تک پیدل جانا

پڑے گا۔“

”ارے بے فکر ہو میں نے کار کا بندوبست کر لیا

ہے۔“ مراد بولا۔

کچھ دیر بعد وردا، مراد اور راجو کار میں اڑے جا

رہے تھے۔ ڈرائیونگ مراد کے ہاتھ میں تھی راجو اس

کے بغل میں جبکہ وردا پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور

کارانی منزل کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔

”نہیں راستہ تو پتہ ہے نا۔“ مراد نے راجو سے

پوچھا۔

”ہاں استاد ابھی تو سیدھے چلتے رہو آگے جو گلی

آئے گی اسی میں ہے یعنی شاہد کا گھر۔“ راجو نے

جواب دیا۔

”پستول کہاں ہے۔“ مراد نے پھر پوچھا۔

”میرے پاس ہے فکر مت کرو۔“ راجو بولا۔

”دھیان سے رکھنا کہیں چل نہ جائے یہ دیسی

پستول بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے کبھی۔“

”تم لوگ پستول بھی ساتھ لائے ہو۔“ وردا نے

حیرانی سے کہا۔

”ہاں میڈم خطرناک قاتل ہے وہ ہمیں بھی تو اپنی

حفاظت کے لیے کچھ رکھنا ہے نا کیا پتہ کب ضرورت

پڑ جائے۔“ مراد بولا۔

”ہاں میڈم استاد ٹھیک کہہ رہا ہے یہ دیسی پستول

بہت کام آئے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسا تم لوگ مناسب سمجھو۔“ وردا

بولی۔

”استاد۔ بس اسی گلی میں موڑ لو۔“ ایک گلی کے کنارے

پڑتے ہی راجو نے مراد کو ہدایت دی۔

مراد نے جیسے ہی گاڑی گلی میں موڑی راجو بولا۔

”وہ رہا اس کا گھر جہاں دوا دی کھڑے ہیں۔“

”مجھے تو یہ دونوں پولیس والے لگ رہے ہیں۔“

مراد نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو استاد۔ یہ پولیس والے ہی

ہیں۔“

”اب ہم کیا کریں۔“ پیچھے سے وردا بولی۔

”میں یہ لیٹر لایا ہوں۔ میں کوریئر والا بن کر جاؤں

گا اور سائن کرنے کے بہانے اسے باہر بلواؤں گا

آپ پہچاننے کی کوشش کرنا کہ وہ وہی پاگل ہے یا

نہیں۔“ راجو یہاں بھی ان دونوں سے آگے نظر آیا۔

”یہ یعنی شاہد اس پاگل کے علاوہ اور کون ہو سکتا

ہے یہ بالکل وہی ہے۔“ وردا نے کہا۔

”وہ تو ہے پھر بھی ایک بار اسے دیکھ تو لو۔“ مراد

نے اپنی صلاح دی۔

”اور اگر وہ باہر نہیں آیا تو۔“ وردا کے دل میں ابھی

بھی وسوسہ تھا۔

”اپنا لیٹر ریسو کرنے تو وہ آئے گا ہی راجو جیسا میں

نے سمجھایا ہے ویسے ہی کرنا۔“ مراد نے راجو سے کہا۔

”ٹھیک ہے استاد۔“

راجو کار سے اتر کر ایک لیٹر ہاتھ میں لے کر اس

گھر کی طرف بڑھا۔

”مسٹر سکندر یہیں رہتے ہیں۔“ راجو نے سادا

لباس والے سپاہی سے پوچھا۔

”ہاں وہ یہیں رہتے ہیں تم کو کیا کام ہے؟“ سپاہی

نے اسے شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ان کا کوریئر ہے۔ ذرا بلوادیں۔ انہیں خود ریسو

کرنا ہوگا۔“

سپاہی نے گھر کے دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبا

دیا تھوڑی دیر بعد ایک آدمی باہر نکلا۔

”آپ ہی مسٹر سکندر ہیں۔“ راجو نے پوچھا۔

”ہاں کیا بات ہے۔“ وہ آدمی بولا۔

”آپ کا کوریئر ہے۔ یہاں سائن کر دیجئے۔“

راجو نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

دور سے وردا نے اس آدمی کو دیکھا اور فوراً بولی۔

”یہ تو وہ آدمی نہیں ہے۔“

”کیا ایسا کیسے ہو سکتا ہے ذرا غور سے دیکھو۔“







چپ کو رکتا دیکھ کر مراد نے بھی اپنی کارتھوڑی  
دوری پر روک لی تھی۔

”یہ سحرش کو یہاں کیوں اتار دیا پولیس والے نے۔“ راجو تشویش سے بولا۔

”اس بات کا جواب تو سحرش ہی دے سکتی ہے۔“  
مراد نے کہا۔

”کیا خیال ہے اسے بھی اپنی کار میں بٹھالیں۔“  
راجو نے سوالیہ نظروں سے مراد کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔  
 ”ناگل، ہو گئے ہو کیا اس نے مجھے بھال لیا تو“

وردا جلدی سے بولی۔  
”مڑ مڑھکا کہہ رہا ہے، حنا کمر لگا رہا ہے۔“

کے بارے میں پتہ ہوا اتنا ہی اچھا ہے بہت نازک

”ٹھیک ہے پھر میں کار سے اتر کر اس کے پاس جا

رہا ہوں م دووں ہر جاؤ۔ راہوںے دوواریہ سوئے  
ہوئے کہا۔

مگر تب تک راجوکار سے اتر کر سحرش کی طرف

”یہ لڑکا بھی نا۔“ مراد جھلا کر بولا۔

سحرس رکشہ پیسی کا انتظار کر رہی تھی اس کا وہ بیان  
اپنی طرف آتے ہوئے راجو کی طرف نہیں تھا کیونکہ

”میری زندگی کیا بن کر رہ گئی ہے یہ سب اس

کمینے کی وجہ سے ہوا ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں  
گی۔“ سحرش کے دل میں ایسی سوچیں ابھر رہی تھیں

اور ان سوچوں نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔  
راجو اس کے پاس آتا ہوا بولا۔ ”ارے حشر کیا

بات ہے۔ یہاں کیا کر رہی ہوں۔“



حشر فوراً اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”تم سے مطلب اپنے کام سے کام رکھو۔“

”ارے بتاؤ تو یہی کہ بات کیا ہے تم رو کیوں رہی ہو اور یہ پولیس کی جیب میں تم کیا کر رہی تھیں۔“ راجو نے پوچھا۔

”تم دفعہ ہو جاؤ یہاں سے تم کون ہوتے ہو یہ سب پوچھنے والے۔“ حشر نے اپنا سارا غصہ راجو پر اتارا۔ اسے ایک رکشا تاہوا نظر آیا تو اس نے رکنے کا اشارہ کیا حشر اس سے بات کرنے لگی۔

”حشر میری بات تو سنو۔“

مگر رکشہ حشر کو لے کر دور جا چکا تھا راجو دوڑ کر کار میں آیا اور بولا۔ ”استاد جلدی اشارت کرو۔ ہمیں اس رکشہ کے پیچھے چلنا ہے۔“

”بات کیا ہے کچھ بتاؤ تو۔“ مراد نے پوچھا۔

”استاد وہ وہاں کھڑی رو رہی تھی۔ مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی اس نے۔“

”پتہ نہیں یہ بھی کس چکر میں ہے چلو دیکھتے ہیں۔“ مراد نے کہا۔

”میں بھی کار میں موجود ہوں یہ بات یاد رکھنا کہیں کسی اور نئی مصیبت میں نہ پھنسا دینا۔“ وردا بولی۔

”فکر نہ کریں میڈم آپ کو کوئی نہیں پہچانے گا۔“ راجو نے کہا۔

مراد نے کار حشر کے رکشہ کے پیچھے لگا دی پندرہ بیس منٹ کے بعد رکشہ ایک مارکیٹ کے باہر رکا اور حشر اتر کر ایک دوکان میں گھس گئی۔

”وہ اپنی شاپنگ کر رہی ہے اور ہم اس کے چکر میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔“ وردا سر جھٹک کر بولی۔

”بعض اوقات یہ وقت گزاری، کارگزاری میں بھی بدل جاتی ہے میڈم۔“ راجو نے دانشورانہ انداز میں کہا۔

”خاصی دلکش لڑکی ہے سچ بتاؤ راجو کہیں تم کسی اور چکر میں تو نہیں ہو۔“ وردا نے پوچھا۔

”نہیں نہیں میڈم میں نے سچ میں اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی بہت خوبصورت ہے آپ کی طرح۔“ راجو بولا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جاؤ جا کر دیکھو تو سہی کہ وہ اس دوکان پر کیا کر رہی ہے۔“ وردا نے کہا۔

”ویسے راجو ٹھیک کہہ رہا ہے آپ بہت خوبصورت ہیں اور حشر آپ کی فکر کی ہے۔“ مراد نے بیک ویو مرر میں وردا کی طرف دیکھا۔

”اس بات سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وردا نے پوچھا۔

”مطلب تو کچھ نہیں بس یہی ہے کہ آپ دونوں بہت خوبصورت ہیں۔ کیوں راجو۔“

”ہاں ہاں بلکہ.....“ راجو اپنا جملہ مکمل نہیں کر پایا اور وردا کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس نے بات بدل دی۔

”استاد دیکھو تو وہ کیا خرید رہی ہے؟“

”یہ اس چاقو کا کیا کرے گی یہ تو گھروں میں استعمال ہونے والے چاقو سے بڑا ہے۔“ مراد نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔“ اپنا اندازہ درست ہونے پر راجو پھیل گیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو راجو مجھے بھی کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔“ مراد نے اس کی تائید کی۔

وردا نے دونوں کی باتیں سن کر گہری سانس لی۔

وہ اپنی مصیبت کو لے کر بے چین تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں حشر کے لیے اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ ”لڑکی خوبصورت ہے اور اس پر کسی کا بھی دل بہک سکتا ہے۔ اور یہ دونوں تو ہیں ہی ایک نمبر کے لفنگے۔“ وردا نے سوچا۔

حشر نے چاقو اپنے پرس میں رکھا اور واپس اسی رکشہ میں آ کر بیٹھ گئی جو اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

رکشہ کے چلتے ہی مراد نے بھی اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔

اگلے دس منٹ بعد رکشہ ایک گھر کے باہر رکا۔

حشر نے اتر کے پیسے ادا کیے۔

مراد نے بھی کچھ دور کا روک لی تھی۔ حشر گھر کا مین گیٹ کھول کر اندر چلی گئی۔

اندر ایک کمرے میں وقاص ایک لڑکی کے ساتھ پیار کی ٹینگیں بڑھانے میں مصروف تھا اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔

”اس وقت کون آ گیا۔“ وقاص جھنجھلا کر بولا۔

”دروازے کے باہر حشر کھڑی تھی۔“

”تم..... تم یہاں کیا کر رہی ہو۔“ وقاص نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ لو تمہارے پچاس ہزار روپے۔“ حشر نے نوٹوں کی گڈی اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ تم یہاں مت آنا میں خود رابطہ کروں گا تم سے۔“ وقاص نے غصے سے کہا۔

حشر نے پچاس ہزار روپے کی گڈی اس کے منہ پر دے ماری۔

”وکی..... کون ہے یہ؟“ اندر والی محبوبہ بولی۔

”کوئی نہیں۔“

”اچھا تو اب اس کی زندگی برباد کر رہے ہو۔“ حشر نفرت سے بولی۔

”جیب گرا اور دفعہ ہو جا یہاں سے۔“

”وکی یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے؟“

”کچھ نہیں بس بکواس کرنے کی عادت ہے اس کی۔“

”یہ وکی تمہاری عریاں فلم بنا رہا ہے اور بعد میں

میری طرح تمہیں بھی کال گرل بنادے گا۔“

”کیا؟“ لڑکی حیران رہ گئی اس نے فوراً اپنا پرس اٹھالیا۔ ”وکی میں جا رہی ہوں یہاں سے۔“

”جھوٹ بول رہی ہے یہ لڑکی پاگل ہے۔“ وقاص نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”مجھے کچھ نہیں پتا مجھے تو پہلے ہی تم پر شک ہو رہا تھا تم بار بار اس پردے کے پیچھے جا کر کیا کرتے تھے؟“

اب شاید ساری کہانی اس لڑکی کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

حشر نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹا دیا اور بولی۔ ”یہ بار بار اس کیمرے کو ایڈجسٹ کرتا ہوگا۔“

”اوہ مائی گاڈ اس کا مطلب ہے اب تک یہاں جو بھی ہوا وہ سب اس میں ریکارڈ ہو گیا ہوگا۔“ لڑکی گھبرا کر بولی۔

”بالکل ہوا ہوگا یہ لو سنبھالو اس کیمرے کو۔“ حشر نے کہا۔

”بہت خوب میرے گھر میں آ کر مجھ سے ہی ہوشیاری اب تم دونوں کا ایک ساتھ سین ریکارڈ کروں گا۔“ وقاص بے غیرنی سے بولا۔

حشر نے تیزی دکھاتے ہوئے اپنے پرس سے چاقو نکالا اور وقاص کے پیٹ پر پھیر دیا جو اس کے پیٹ کی اوپری کھال کو چیرتا ہوا نکل گیا اور وقاص کے پیٹ پر خون ابھرا آیا یہ دیکھ کر وقاص کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔

”کیوں نہ ہم تمہارے مرنے کی ویڈیو بنائیں۔“ حشر نے نہایت سنگدلی سے کہا اب تک اس کے ساتھ جو ہوا تھا اس نے حشر کے اندر سے تمام انسانی جذبات مٹا کر رکھ دیئے تھے۔

”میں جا رہی ہوں پلینز مجھے اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ لڑکی بوکھلا کر بولی۔

”جیسے تمہاری مرضی مگر میں آج اسے زندہ نہیں







نے کہا۔

”ہاں بابا جاری ہوں تم کیا یہی پوچھتے تھے؟“  
نغمہ نے استفسار کیا۔

”نہیں میں تو تمہارا حال چال پوچھنے آیا تھا۔“  
راجو نے دانت نکالتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”سحرش کہاں ہے؟“

”سورہی ہے لگتا ہے آج کالج میں بہت تھک گئی ہے بیچاری۔“

”ایک بات کا دھیان رکھنا بھولو سے زیادہ فری مت ہونا۔“

”تمہیں اس سے کیا کہ میں اس سے کتنا فری ہوتی ہوں۔“ نغمہ نے دونوں ہاتھ کمرے پر جاتے ہوئے کہا۔

”جو تیرا من کرے وہ کرنا میں تو چلا۔“ یہ کہہ کر راجو اپنے راستے چلا اور نغمہ بھولو حوالدار کے گھر کی طرف چل دی۔

☆☆☆.....

نغمہ نے بھولو حوالدار کے گھر کا دروازہ کھڑکایا۔  
”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔

نغمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”دروازہ کھول کے دیکھ لے نا کہ کون ہے۔“ نغمہ بڑبڑائی۔

بھولو نے دروازہ کھولا اور باہر نغمہ کو دیکھ کر اس کی بانجھیں کھل گئیں۔

”ارے نغمہ تم یہاں کیسے آؤ اندر آ جاؤ۔“ اس نے ایک طرف ہو کر نغمہ کو اندر آنے کے لیے جگہ دی۔

”ایکٹنگ دیکھو بڈھے کی کمینہ نہیں کا۔“ نغمہ نے دل ہی دل میں کہا۔

”بتاؤ کیا لوگی ٹھنڈا یا گرم۔“ بھولو نے مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں یہاں کیوں آئی

ہوں؟“ نغمہ نے سوال کیا۔

”معلوم ہے وہ تو میں یونہی مہمان نوازی کے طور پر پوچھ رہا تھا۔“ بھولو نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تمہاری بیوی کہاں ہے۔“ نغمہ نے اندر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”بیوی یہاں ہوتی تو تم کو کیسے بلاتا۔“

”میں یہاں راجو کے کہنے پر آئی ہوں۔“ نغمہ نے یوں کہا جیسے اس کی کوئی مرضی نہیں تھی۔

”اچھی بات ہے راجو نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔“  
”اور میں نے راجو سے کیا ہوا وعدہ۔“ نغمہ نے جوابا کہا۔

”تو پھر کیا ارادہ ہے؟“ بھولو کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔

اور اس کے بعد ظاہر ہے نغمہ کو بھولو کا فراموشی پروگرام پورا کرنا پڑا۔

”مجھے فریش ہونا ہے۔“  
”واش روم وہ سامنے ہے۔“ بھولو نے اشارے سے بتایا۔

نغمہ فوراً واش روم میں گھس گئی جب وہ ہاتھ منہ دھو رہی تھی تو اچانک اس کی نظر کھونٹی پر لگی قیص پر گئی۔

”یہ قیص پر خون جیسے دھبے..... وہ بھی اتنے سارے..... کیا ماجرا ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”کیا ہوا پانی تو آ رہا ہے۔“ باہر سے بھولو کی آواز آئی۔

”ہاں آ رہا ہے۔“ نغمہ نے جواب دیا۔ اسے اب تھوڑا تھوڑا ڈر لگ رہا تھا۔ جب وہ باہر آئی تو اس نے

ٹی وی پر رکھے چاقو کو دیکھا۔ جس سے اس کا ڈر اور بڑھ گیا۔

”مجھے اب چلنا ہوگا۔“  
”میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔“ بھولو نے پیش

کش کی۔

”نہیں میں خود چلی جاؤں گی ابھی تو ہی تو بجے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چپ چاپ وہاں سے نکل گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے اس قیص پر خون کے اتنے دھبے کیسے تھے اور وہ ٹی وی پر رکھا چاقو کچھ لال لال نشان اس پر بھی تھے۔“ نغمہ چلتے چلتے بڑبڑا رہی تھی۔

اچانک اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ تھر تھر کا پٹنے لگی۔ ”یہ میرا پیچھا کون کر رہا ہے۔“ نغمہ خود سے مخاطب ہوئی۔ ”گھبرا مت۔“

سارے قتل دس بجے کے بعد ہی ہوئے ہیں اور ابھی تو نوہی بجے ہیں۔ پانچ منٹوں میں راجو کے کمرے پر پہنچ جاؤں گی۔“ وہ بڑبڑائی۔ لیکن اس کے پیچھے مسلسل قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی۔ ”اے خدا مجھے محفوظ رکھ۔“

وہ تھوڑی دیر چپ چاپ چلتی رہی اور پھر اچانک اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا مگر اسے اپنے پیچھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ”بھولو کیا تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔“ وہ زور سے بولی۔

لیکن اسے اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ ”بھاگ نغمہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔“

وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور دو منٹ میں راجو کے کمرے کے باہر آ پہنچی اس کی سانس بری طرح سے پھولی ہوئی تھی وہ زور زور سے راجو کے کمرے کا دروازہ پینے لگی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔

”اوہ یہاں تو تالا لگا ہوا ہے۔“ اب نغمہ کی نظر تالے پر پڑی جو اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ ”وہ ضرور اپنے استاد کے ساتھ ہوگا۔“

نغمہ کا اپنا گھر ابھی دور تھا جبکہ مراد کا کمرہ نزدیک

ہی پڑتا تھا وہ تیز تیز قدموں سے مراد کے کمرے کی طرف چل دی اب وہ بھاگ نہیں رہی تھی کیونکہ سڑک پر اس کے علاوہ بھی چار پانچ لوگ موجود تھے۔

جس سے نغمہ تھوڑا حوصلہ مل رہا تھا۔

اب وہ مراد کے کمرے تک پہنچ کر دروازہ بجانے لگی اور مراد نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

”کیا ہوا پاگل ہو گئی ہو کیا۔“ مراد نے پوچھا۔  
”ر..... راجو کہاں ہے۔“ نغمہ نے کہا۔

”راجو یہیں ہے۔ بتاؤ تو بات کیا ہے۔“  
نغمہ کی آواز سن کر راجو بھی دروازے پر آ گیا۔

”نغمہ تم یہاں کیا ہوا تم بھولو کے پاس نہیں گئیں کیا۔“  
”وہیں سے آ رہی ہوں میری جان خطرے میں ہے۔“ نغمہ کے لہجے میں خوف کا عنصر نمایاں تھا۔

”کیا بول رہی ہو تم سے تو ساری دنیا کی جان اور ایمان خطرے میں ہے تمہیں کس نے خطرے میں ڈال دیا۔“ مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔“  
نغمہ بولی۔

ان باتوں کے دوران نغمہ دونوں کے ساتھ کمرے کے اندر آ گئی تھی۔

”آؤ یہاں بیٹھ کر آرام سے پوری بات بتاؤ۔“  
وردانے اسے اپنے پاس بلایا۔

نغمہ جا کر وردا کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ”جب میں بھولو کے گھر سے نکلے تو مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ بھاگ کر آئی ہوں یہاں تک یہ ضرور بھولو کی کارستانی ہے۔“

”مگر بھولو ایسا کیوں کرنے لگا۔“ راجو نے کہا۔

”میں نے اس کے واش روم میں ایک نیلے رنگ کی قیص لٹکی دیکھی تھی جس پر خون کے بہت سارے دھبے تھے اور تو اور اس کے ٹی وی کے اوپر ایک چاقو

مید مبارک مید مبارک مید مبارک

نغمہ آفاق 65 اگست 2013

مید مبارک مید مبارک مید مبارک

نغمہ آفاق 64 اگست 2013

مید مبارک مید مبارک مید مبارک

نغمہ آفاق 64 اگست 2013

مید مبارک مید مبارک مید مبارک

نغمہ آفاق 64 اگست 2013



بھی رکھا ہوا دیکھا میں نے اس پر بھی ہلکے ہلکے لال نشان تھے۔“ نغمہ بولی۔

”تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے بھولو ایسا آدمی نہیں ہے صورت اس کی جیسی بھی ہے لیکن دل سے نیک ہے وہ۔“ راجو نے بھولو کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں بہت نیک ہے جب ہی تو اپنے کام کے لیے اس نے تم سے مجھے مانگ لیا تھا۔“ نغمہ جھٹ سے بولی۔

یہ سنتے ہی مراد ہنسنے لگا اور وردانے منہ پھیر لیا۔

”ہنس کیا رہے ہو میں سچ کہہ رہی ہوں اور وہ.....“

نغمہ آگے بھی کچھ بولنے والی تھی مگر راجو نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”نغمہ ذرا دھیان سے۔ وردا میڈم بھی بیٹھی ہیں یہاں۔“

”تو کیا ہوا میں سچ ہی تو کہہ رہی ہوں اور سچ کہنا جرم ہے کیا۔“

”اصل ماجرا کیا ہے کوئی تمہارا پیچھا کر رہا تھا یا یہ کہ بھولو نے نیک ہوتے ہوئے بھی راجو سے تمہیں مانگ لیا۔“ مراد نے مزے لیتے ہوئے کہا۔

اچانک وردا نے کچھ ایسا دیکھا کہ وہ فوراً بول پڑی۔

”یہ سچ کہہ رہی ہے جو بھی اس کا پیچھا کر رہا تھا وہ یہاں تک آ گیا ہے کھڑکی سے کوئی جھانک رہا ہے۔“ وردانے یہ بات اتنے دھیمے لہجے میں کہی کہ صرف پاس کھڑے راجو کو ہی سنائی دی مراد کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ وردانے کیا کہا۔

”تمہاری ایسی کی تھی۔“ راجو نے آؤ دیکھنا تاؤ اپنا پستول نکالا اور فوراً کھڑکی کی طرف فائر کھول دیا۔

مراد کو بھی پوری بات سمجھتے دیر نہیں لگی اور اس نے پھر کی کے ساتھ بیڈ کے نیچے سے ہاکی نکالی اور دروازہ کھول کر باہر بھاگا۔ راجو بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

”اس کے سر پر گولی لگی ہوگی۔“ راجو بولا۔

”بے وقوف اسے گولی لگی ہوئی تو اس کی لاش اپنی کھڑکی کے نیچے پڑی ہوئی یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ مراد نے آس پاس نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”اتنی جلدی تو وہ یہاں سے بھاگ نہیں سکتا گیا کہاں وہ۔“ راجو بولا۔

مراد بھاگ کر واپس کمرے میں آیا۔

”تم دونوں ڈرنا مت اندر سے کنڈی لگا لو اور کھڑکی کو بھی اندر سے بند کر لو میں اور راجو بھی عقل ٹھکانے لگاتے ہیں اس کی۔“ مراد نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

وردانے کھڑکی اور دروازہ بند کر دیا اور نغمہ سے بولی۔

”تم فکر مت کرو تم یہاں محفوظ ہو۔“

”دیکھا کتنی ہمت کی اس نے میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا۔“ نغمہ نے کہا۔

”واقعی وہ کھڑکی سے جھانک کر بھی دیکھ رہا تھا۔ چہرہ ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پائی ورنہ پہچان لیتی کہ یہ وہی پاگل قاتل تھا یا نہیں۔“

”تمہیں ان باتوں کی پڑی ہے جبکہ میرا تو آج کا سارا مزہ ہی کر کر رہا ہو گیا۔“ نغمہ نے منہ بنا کر کہا۔

”تم بھی عجیب لڑکی ہو ابھی خود بھی تو اس بارے میں بول رہی تھیں۔“ وردا بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن انسان کا اپنا موڈ بھی تو ہوتا ہے نا سارے موڈ کا ستیاناس ہو کر رہ گیا۔“

”ٹھیک ہے سمجھ گئی۔“ وردا جلدی سے بول پڑی کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ اس لڑکی کی بے لگام زبان چل پڑی تو سارا آنکھوں دیکھا ماجرا بیان کرنے کے بعد ہی تھمتے گی۔

”ابھی کہاں سنو تو سہی ہوا دراصل ایسے کہ جب میں بھولو۔“ شاید سب کچھ بتانے کے لیے نغمہ کے پیٹ میں درد اٹھ رہا تھا۔

”بس میری ماں میں سب سمجھ گئی کہ تم کیا کہنا

چاہتی ہو۔“ وردانے اسے ٹوکا۔

لیکن نغمہ بھی ایک ڈھیٹ تھی بڑی رسائی کے ساتھ اپنا اور بھولو کا قصہ سنائی رہی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وردا کی سانس پھولنے لگیں۔

”چل ٹھیک ہے ہو گئی تا تیری کہانی ختم یا ابھی بھی باقی ہے۔“

”ہائے سچ تمہیں سب بتا کے میرا پیٹ ہلکا ہو گیا تھینک یو۔“ نغمہ نے چین کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وردانے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

”لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھولو کو یہ تماشہ کرنے کی کیا ضرورت تھی میں پہلے ہی اس کے واش روم میں وہ بیٹھ دیکھ کر ڈر گئی تھی تمہیں نہیں لگتا کہ اسے یوں میرا پیچھا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ نغمہ نے وردا پر سوال چھڑ دیا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا پیچھا کرنے والا بھولو نہ ہو بلکہ کوئی اور ہو۔“

”اس کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ وہی ہے وہ پاگل قاتل۔“

”مراد اور راجو کو آنے دو سب پتہ چل جائے گا کہ تیرے پیچھے کون تھا۔“ وردانے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ایک گھنٹہ ہو گیا انہیں گئے ہوئے کہاں رہ گئے دونوں مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ یہ ڈر نغمہ کے چہرے سے بھی ٹپک رہا تھا۔

”ابھی تو اچھل اچھل کر خوب بول رہی تھیں اور اب ڈر لگ رہا ہے تجھے۔“ وردانے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔

”میں بھی انسان ہوں پتھر نہیں ہوں میں ایک تو اپنی پرائیویٹ باتیں بتاؤ اوپر سے یہ سب بھی سنو سنو پتہ نہیں ہے میری سہیلیاں راستہ روک روک کر قتل میں میری باتیں انہیں بہت مزہ آتا ہے میری

باتوں سے اور ایک تم ہو جسے میری باتوں میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔“ نغمہ نے انہیں بھرے لہجے میں کہا۔

ادھر یہ باتیں چل رہی تھی دوسری طرف مراد اور راجو پیچھا کرنے والے کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے۔

”استاد وہ چھلاوے کی طرح کہاں غائب ہو گیا۔“ راجو بولا۔

”نزدیک ہی جھاڑیوں کا جنگل شروع ہوتا ہے ہو سکتا ہے اس طرف نکل گیا ہو۔“ مراد نے خیال ظاہر کیا۔

”چلو پھر جنگل میں ہی چلتے ہیں۔“ راجو کچھ زیادہ ہی بہادری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟“ راجو اور مراد کو کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ دونوں گھوم گئے۔

”اے رنجو تم یہاں نہ مرنے تو ہمیں ڈرائی دیا تھا۔ تم بتاؤ تم کیا کر رہے ہو اتنی ٹھنڈ میں۔“ انٹار راجو نے پوچھ لیا۔

”میں نے ابھی کوئی چلنے کی آواز بھی وہی سن کر باہر آیا ہوں۔“

”وہ تو ہم نے بھی سنی تھی مگر اس بات کو تو ہمیں منٹ کے قریب ہو رہے ہیں تم اب نکلے ہو باہر۔“ مراد بولا۔

”وہ میں اس وقت ٹوائٹ میں تھا ابھی فارغ ہوا ہوں تو دیکھنے آیا ہوں کہ بات کیا ہے؟“ رنجو نے دیر سے باہر نکلنے کی وجہ بیان کی۔

”بڑی عجیب بات ہے کسی اور گولی کی آواز سنائی نہیں دی صرف تم نکلے ہو دیکھنے۔“ راجو نے شک بھرے لہجے میں پوچھا۔

”لوگ ٹی وی دیکھنے میں غرق رہتے ہیں انہیں سنائی نہیں دیا ہوگا یا سمجھے ہوں گے کہ کسی چینل پر فائرنگ کا سین ہوگا۔“ رنجو کے پاس اس سوال کا بھی موزوں جواب موجود تھا۔

”جاؤ کھر جا کر سو جاؤ لگتا ہے آج وہ پاگل قاتل اسی علاقے میں شکار کرے گا۔“ مراد نے کہا۔



ایک نوجوان کی روداد عشق، وہ اپنی محبوبہ کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر محبوبہ کا باپ اس کے سامنے کسی اپنی چٹان کی طرح حائل تھا۔ ان لمحوں کا فسانہ جب وقت یکایک سب کچھ بدل کر رکھ دیتا ہے۔

اداس لمحوں کے لیے ایک ہنستی مسکراتی تحریر

پولیس میں ملازمت مل گئی اس کے ایک ہی ہفتے بعد وہ  
بیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔  
اس انکشاف پر نوید بہت گر جا رہا تھا۔ اس نے  
سمیرہ کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن وہ بھی ضد  
کی پکی تھی اور اس نے دو ٹوک انداز میں کہہ دیا تھا کہ  
زندگی اس کی اپنی ہے اور وہ اس زندگی میں مسرتوں کا  
رس گھولنے کے لیے وہی کرے جو اس کا دل کہے گا۔  
”شاید تمہیں نہیں معلوم کہ فرزندوں کے آادی ہے  
وہ تمہیں خوش نہیں رکھ سکے گا۔“

”میں پاپا میرے نزدیک وہ ہیرا ہے ایسا ہیرا جس کی کوئی قیمت ادا نہیں کر سکتا آپ مانی حالت کیوں دیکھتے ہیں اس کے دل میں جھانک کر دیکھیں اس میں ایسا ننداری اور محبت کی دولت بھری ہوئی ہے۔“

”تم اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں۔“

”میں‘ میں تو شادی سے پہلے اس کا نام سن کر ہی خوش ہو چلا ہوں پایا۔ زندگی بھگھلاتے ہوئے کپڑو ں سامانِ عیش اور دولت کا ہی تو نام نہیں۔ وہ کیسی ڈرامہ رے مگر اتنی سخت کرتا ہے کہ آج کا کوئی نوجوان اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا اور جب وہ پولیس فورس میں شامل ہو جائے گا تو پھر اس کے حالات بھی اچھے ہو جائیں گے۔“

سمیرا کا ذہن بدلنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تو اس کے باپ نے بے کوششیں شروع کر دیں کہ فرزانہ فورس میں شامل نہ ہو سکے وہ جانتا تھا کہ اگر فرزانہ فورس میں شامل نہ ہو سکا تو وہ بھی اس سے سمیرا کا ہاتھ نہیں

شارجہ میں قانون کی سخت پابندی کرنا پڑتی تھی اور نوید یوے ای میں ٹریفک پولیس میں تھا۔ فراز اس کا پڑوسی تھا۔ ان دونوں کا اپارٹمنٹ ایک ہی بلڈنگ میں تھا۔ نوید کی ایک ہی بیٹی سمیرا تھی جب کہ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ نوید فراز سے ہمیشہ مخالف رہتا تھا۔ نوید کا تعلق انڈیا سے تھا۔ جب کہ فراز پاکستانی شہری تھا۔

فراز کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ رات کے وقت وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی ہیڈ لائٹس کو بجھا کر استاما نگا کرتا تھا اور اسی سبب سٹی وارڈن اس سے ٹالال رہتا تھا۔ ایک روز جب پولیس وارڈن سے اس کا آمناسامنا ہوا تو پولیس والے نے بڑی نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”تم کبھی نہ بھی ضرور پکڑے جاؤ گے کسی دن اگر میں نے تمہیں لائٹوں سے کھیلنے ہوئے دیکھ لیا تو تمہارا لمبا جالان کرادوں گا اور تم سرایتی رہ جاؤ گے۔“

میلن فرزاں اچھی طرح جانتا تھا کہ نوید اسے صرف  
ہیڈ لائٹس جلانے بجھانے کی وجہ سے پکڑنا نہیں چاہتا  
بات کو کچھ اور بھی تھی۔ ہیڈ لائٹس جلا بھگا کہ تو ہڑرائی  
راستہ اٹھتا تھا۔ اصل بات یہی سیراکو فرزاں سے محبت تھی  
اسی باعث وہ فرزاں سے پر خاش رکھتا تھا اور سیراکو نوید کی  
اکوفی مٹی تھی۔ اگر سیراکو فرزاں کے تعلقات دو بے  
فکروں جیسے ہوتے تو شاید نوید زیادہ برا نہ مانتا لیکن نوید  
کو سیراکو کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ فرزاں سے شادی  
کرنا چاہتی ہے۔ طے نہ پایا تھا کہ فرزاں کو جس روز

آج کل لوگ نوبے ہی گھروں میں گھس جاتے ہیں۔“  
مراد نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔  
انہی باتوں میں دونوں بھولو گھر پہنچ گئے۔  
”ارے دروازے پر تو تالا پڑا ہے۔“ راجو نے کہا۔  
”واقعی..... کہاں گیا ہوگا؟“ مراد بڑبڑایا۔

”اب تو سب صاف ہو گیا“ غمہ کا پیچھا کرنے والا وہی تھا مگر اس نے ایسا کیوں کیا جبکہ غمہ نے اس کی فرمائش بھی پوری کر دی تھی۔“ راجو بولا۔

”ہو سکتا ہے وہ جان لینے کا بھی شوقین ہو۔“

”مطلب تم مان رہے ہو کہ بھولو بھی پاگل قاتل ہو سکتا ہے مگر سحرش نے جو کہا اس کا کیا کریں۔“ راجو عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔

”ارے مذاق کر رہا ہوں ہو سکتا ہے بھولتا لاگا کر  
کسی کام سے گیا ہو اس کی پولیس کی نوکری ہے شاید  
ڈیوٹی برگیا ہو۔“ مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔  
”مگر تم نے جو میٹھ دیکھی تھی خون کے دھبوں  
والی اور وہ چاقو؟“  
”یہ سب جاننے کے لیے ہمیں یہ تالا کھولنا ہوگا۔“  
مراد نے کہا۔

(باقی آئندہ)



”ایسی بات تو نہ کرو مراد بھائی مجھے ڈر لگتا ہے ایسی باتوں سے میں تو چلا۔ ہم بھی جاؤ اپنے اپنے گھر۔“  
 راجو اپنے گھر میں گھسا اور کندہ لگا دی۔  
 ”استاد کہیں یہ راجو ہی تو نغمہ کا بیچھا نہیں کر رہا تھا۔“ راجو نے پھر عقل دوڑائی۔

”ہمیں یہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا یہ ضرور اسی پائل  
قاتل کا کام ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اس پاس ہی  
ہے کل اسی جنگل سے تو آئے تھے، ہم ہو سکتا ہے وہ  
بھی ہمیں ڈھونڈ رہا ہو۔“ مراد نے کہا۔  
”مگر نگہ جو کہہ رہی تھی اس کا کیا ہو سکتا ہے بھولو  
ہی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔“

”ہوں چلو اس کے گھر چلتے ہیں۔ ابھی ساری بات کلیئر ہو جائے گی۔“ مراد بولا۔

”مگر ایک بات ہے۔ یہ دونوں بہنیں الگ الگ آدمی کو قاتل بتا رہی ہیں۔“ راجو ابھی بھی سوچ میں تھا۔

”دیکھو حشر کی بات پر تو مجھے یقین ہے باقی نغمہ کا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”مگر نغمہ کو بھی جھوٹی کہانی بنانے کی کیا ضرورت ہے استاد۔“ راجو نے اپنی محبوبہ کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

”تو چلو، نایا، ابھی بھولو کے گھر جا کر دودھ کا دودھ  
اور پانی کا پانی کر دیتے ہیں۔“  
”ٹھیک ہے۔“ راجو بھی تیار ہو گیا۔  
دونوں بھولو کے گھر کی طرف چل پڑے۔  
”استاد ایک بات نوٹ کی تم نے۔“  
”کھا رہا ہوں؟“

”ابھی دس بھی نہیں بجے اور سڑکیں سنسان ہو گئی ہیں۔“ راجو نے سڑک پر پھیلے سناٹے کی طرف دھیان دلاتے ہوئے کہا۔



مانگے گا۔

ایک روز مقابلے کا امتحان ہوا اور فراز کا نام ان لوگوں میں سرفہرست نظر آیا۔ جنہوں نے یہ ابتدائی امتحان پاس کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کی تعداد بیس سے زیادہ تھی اور صرف پانچ افراد کو فوری طور پر بھرتی کیا جانا تھا اس صورت حال میں نوید کے پاس صرف ایک راستہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح فراز کا ڈرائیونگ لائسنس منسوخ کرادے تاکہ انٹرویو کے دوران جب بورڈ کو یہ معلوم ہو کہ امیدوار ٹریفک کے ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنا لائسنس منسوخ کراچکا ہے تو اسے فہرست سے خارج کر دیا جائے۔

فراز کو یہ سب معلوم تھا لیکن اسے بھی نوید سے نفرت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ خود نوید بھی اس سے نفرت نہیں کرتا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ اسے اپنی بیٹی سے شدید ترین محبت تھی اور نوید تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بیٹی جس کو اس نے ماں اور باپ بن کر بالا ہے کسی دوسرے کے ساتھ چلی جائے اور وہ تنہائیوں کا شکار ہو جائے سمیرا کی ماں کا انتقال پندرہ سال قبل ہوا تھا۔ اس وقت سمیرا صرف دو سال کی تھی۔ اس کے بعد نوید ہی نے اسے بالا پوسھا تھا اور اپنی تمام خوشیاں بچ کر کے سمیرا کو سب کچھ دیا تھا۔

سمیرا اور فراز بچپن کے ساتھی تھے۔ ان کی تعلیم ایک ہی اسکول میں ہوئی تھی۔ وہ کلاس فیلو ہے تھے اور بچپن کی یہ محبت برسوں میں پروان چڑھتے چڑھتے اب مقدس رشتے کا مطالبہ کرنے لگی تھی۔ فراز نے ٹیکسی اسٹینڈ پر کھڑی کی ہی تھی ایک شخص جھپاک سے ٹیکسی کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ایسی جگہ کا نام لیا جو زیادہ مشہور تو نہیں تھی مگر لوگ وہاں بہت جاتے تھے۔

مسافر کی طرف دیکھے بغیر فراز نے گیسر بدلے اور گاڑی چلا دی چند لمحوں بعد ہی وہ ایک کونے پر گاڑی روک رہا تھا۔

”بس ایک منٹ میں واپس آیا بیٹیں میرا انتظار کرنا۔“ مسافر کو دروازہ کھلا چھوڑتے ہوئے بار میں چلا گیا۔

فراز سگریٹ سلگا کر سمیرا کے بارے میں سوچنے لگا ابھی وہ مستقبل کے سہانے سنے ہی دیکھ رہا تھا کہ اسے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز اندر سے آئی تھی۔ اس نے چونک کر اس دروازے کی طرف دیکھا اور سن ہو کر رہ گیا۔ ایک شخص ریوالور تھا۔ یہ دوڑتا ہوا آ رہا تھا یہی اس کا مسافر بھی تھا۔ اس سے قبل کہ فراز کچھ کرتا، مسافر عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور ریوالور ہلاتے ہوئے بولا۔

”چلو.....“

فراز صرف ایک لمحے میں اسے پہچان گیا۔ چہرہ بہت سے لوگوں کے لیے شناسا تھا۔ اس کی تصویر ہر اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ وہ بدنام زمانہ قاتل بگ تھا جسے آج رات پھانسی دی جانی تھی لیکن وہ عین وقت جیل سے فرار ہو گیا تھا۔

شہر میں تعینات ہر سپاہی بگ کی تلاش میں تھا اور حکم یہ تھا کہ اسے دیکھتے ہی گولی ماری جائے۔ فراز کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ قاتل کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ یقیناً بار میں کسی گول کر کے آیا تھا اور فراز کو یقین تھا وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے مزید قتل بھی کر سکتا ہے لیکن وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر میں بگ کو گرفتار کرانے کے اس سہارے موقع سے فائدہ اٹھا سکوں تو تو سمیرا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی۔ انٹرویو بورڈ شخص اسی کا نام لے کر سمیرا کے پاس کر دے گا۔

اس نے گیسر ڈالے اور گاڑی ایک زنانے کی آواز سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے جان بوجھ کر رفتار تیز رکھی تاکہ پولیس والے اس کو پکڑنے کے لیے پیٹرول کار میں اس کے پیچھے لگ جائیں۔

”آہستہ رفتار قانون کی حدود میں رکھو جو ان میں

عجلت میں نہیں ہوں۔“ بگ نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا اور فراز مایوسی سے رفتار کم کرنے لگا۔

لیکن وہ اتنا بھی مایوس نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر بگ اس کی مدد سے پکڑا گیا تو مستقبل کے تمام بچنے شے مندرہ تعبیر ہو سکیں گے اور اگر وہ نکل گیا تو اس کا سارا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ بگ کو مزید قتل و خون سے روکنے کے لیے فراز کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تھا۔ انسانی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ قاتل خراج لیتے پھریں۔

فراز کے ذہن میں بے شمار خیالات گردش کرنے لگے لیکن اس نے ان سب کو ناقابل عمل قرار دے کر مسترد کر دیا۔ وہ اپنی ٹیکسی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا سکتا تھا لیکن اس صورت میں زخمی بگ فرار ہونے کے لیے اندھا دھند فائرنگ کر دیا اور کئی معصوم راہ گیر موت کی نیند سوچاتے یا لفرض محال وہ اس کے باوجود بھی فرار نہ ہوا اور گرفتار کر لیا جائے۔ فراز کی تعریف تو بہت کی جاتی لیکن اسے فورس میں شامل نہ کیا جاتا کیونکہ اس پر یہ الزام لگ سکتا تھا کہ اس نے ایک ملزم کو گرفتار کرانے کے لیے راہ گیروں کو قتل کر دیا۔

تب ہی اسے ایک انوکھی ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ وہ جس سڑک پر تھے وہ اس چوراہے پر ختم ہوئی تھی جہاں نوید کی ڈیوٹی ہوتی تھی اور فراز کو اس کی دھمکی بھی یاد آ رہی تھی۔

وہ چوراہے پر پہنچ کر سرخ سنگل کے باعث رک گیا۔ تین سبز بوٹیوں پر فراز نے ایک سیلیٹر پر پاؤں رکھتے ہوئے ہیڈ لائٹس کی مرتبہ جلائی بھجائی۔

اسی لمحے نوید کی نظر اس کی ٹیکسی پر پڑی۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

فراز نے عقب نما میں دیکھا اسے یقین تھا کہ نوید پیٹرول کار کو فراز کے بارے میں مطلع کرے گا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ نوید نے فوراً ایک گزرنی

ہوئی کار کو ہاتھ دے کر روکا اور کاران کے تعاقب میں لگ گئی۔ وارڈن کار کے رنگ بورڈ پر کھڑا ہو گیا۔

فراز مسکرانے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ نوید اس کا لائسنس منسوخ کرنے کے لیے بہت عجلت سے کام لینا چاہتا ہے۔ اس نے ٹیکسی کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ آئندہ چند منٹوں میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ نوید کو یقیناً یہ علم نہیں ہوگا کہ ٹیکسی میں بگ موجود ہے۔ جیسے ہی اس کی کار ٹیکسی کے گھر کے گی بگ اس پر گولی چلا دے گا اور یہ صورت حال بہت خطرناک ثابت ہوگی۔ وہ نہ صرف خود بلکہ بوڑھے نوید کو بھی خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

ریوالور اب بھی بگ کے ہاتھ میں تھا۔ تاہم اسے ابھی تک تعاقب کا شہ نہیں ہوا تھا لیکن اگر اس نے پلٹ کر دیکھ لیا تو اسے تعاقب کا احساس ہو جائے گا۔ ”اگلے موڑ سے مغرب کی طرف گھوم جانا۔“ بگ نے کہا۔

”بہت بہتر جناب۔“ فراز نے اس حکم کا مطلب سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ بگ اسے صحرائی طرف لے جا رہا تھا۔ شاید اس کی نیت یہ تھی کہ وہ صحرائی سڑک پر پہنچ کر فراز کو بریک لگانے کے لیے کہے گا اور پھر اس کے سر پر چوٹ لگا کر ٹیکسی خود لے جائے گا۔

فراز نے مغرب کی طرف گاڑی موڑتے ہوئے سمندر کی سمت جانے والا راستہ اختیار کیا۔ تعاقب کرنے والی کار اب ٹیکسی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی پرانی ٹیکسی عقب میں آنے والی چمکتی ہوئی نی کار کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور ہوا بھی یہی دونوں گاڑیوں میں فاصلہ کم ہونے لگا۔

موت اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ خود کو خطرے میں دیکھ کر بگ اس کا کیا حشر کرے گا۔

”گاڑی روکو۔“ شاید بگ ٹیکسی کی رفتار سے گھبرا



## اشکيل صدیقی

محبت اور نفرت تو ایسے رویے ہیں جو اگر انسانی ذہن پر حاوی ہو جائیں تو ہزدل سے ہزدل شخص بھی شیردل ہو جاتا ہے اور وہ کرگڑتا ہے جس کی اس سے کوئی توقع بھی نہیں کر سکتا۔

ایک قتل کی رویداد جس کے دو عینی شاہد تو موجود تھے مگر قاتل نظروں سے اوجھل تھا

دھماکے سے کھلا اور دو عورتیں عالم بدحواسی میں بری طرح چیختی ہوئی نیم تاریک سڑک پر بے تحاشا دوڑتی نظر آئیں۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا ان تک پہنچا۔  
 ”دوڑو..... پکڑو..... اسے پکڑو“ ایک عورت اسٹریٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہدایاتی انداز میں چیخ پڑی۔

میں نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا لیکن ارد گرد کسی تنفس کا نام و نشان تک نہیں تھا البتہ کار ضرور موڑ کاٹ رہی تھی۔ میں کار کے پیچھے ہی بگسٹ بھاگ اٹھا لیکن کسی تیز رفتار کار سے مقابلہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ شام کے پھیلتے اندھیرے میں اس کی نمبر پلیٹ تک پڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسی لمحے دو افراد دوڑتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ کار کے پیچھے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن میرے بولنے سے قبل ہی وہ مجھ پر ہلے بول چکے تھے نتیجتاً ہم تینوں سڑک پر اس طرح گھرے کہ میں سب سے نیچے تھا۔

”پڑ لیا.....“ ان میں سے ایک چیخا اور دونوں اٹھ کر مجھے مہلت دیئے بغیر گھسٹتے ہوئے ان دونوں خواتین تک لے گئے اس وقت تک بہت سارے پڑوسی ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے اور ہم تینوں ہی باہر رہے تھے۔

”مس رو یا! کیا یہ وہی ہے؟“ ان میں سے ایک

میں اسٹیڈیم میں جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے میرے دفتر کی عمارت واضح نظر آرہی تھی۔ میرا دھیان اسی طرف تھا اور میں چاہنے کے باوجود کھیل میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا نہ جانے کیوں میری کیفیت اضطراب آشا ہو رہی تھی، کھیل ختم ہوا تو میں دل میں اضطراب سمیٹے دفتر آ گیا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازے کے قریب فرش پر بڑے ہوئے ایک لفافے نے میری توجہ اپنی طرف پھینچ لی مجھے حیرت نہیں ہوئی بلکہ اس اضطراب کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ میں نے لفافہ اٹھا کر کھولا اس میں ایک خط تھا اور پانچ ہزار کے چھ نوٹ اس سے نکلی کیے ہوئے تھے میں نے خط کو دل کر بڑھا کر پڑھا۔

”ڈیئر پرویز! اس سے قبل کہ وہ مجھے ہلاک کر دے فوراً میرے پاس پہنچ جاؤ، میری نگرانی کی جا رہی ہے اگر تم میری مدد کر سکو تو یہ رقم تمہاری ہے، مزید رقم کی توقع بھی کر سکتے ہو فوراً پہنچو۔ فقط عثمان زکریا!“

میرے نے وقت دیکھا کافی دیر ہو چکی تھی اس کے زندہ ہونے کا امکان کم تھا لیکن تین ہزار میری رگوں میں گردش خون تیز کرنے کے لیے کافی تھے میں اگلے قدموں سب وے کی جانب دوڑ پڑا۔

جب میں خط میں درج پتے پر پہنچا تو سورج غروب ہو رہا تھا ابھی میں الونیو پر واقع اس مکان سے نصف بلاک کے فاصلے پر تھا کہ مکان کا دروازہ ایک

بڑے غصے سے جواب دیا۔  
 اچانک ہی نوید نرم پڑتا چلا گیا۔ ”تم نرمے بدھو ہو  
 فراز کیا تمہارا خیال اب بھی یہی ہے کہ میں تمہیں  
 پکڑنے کے لیے دوڑا تھا۔ نہیں، میں نے تمہاری کسی  
 میں بگ کو دیکھ لیا تھا۔ اس وقت اچانک ہی مجھے تم  
 سے محبت ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ تم خطرے میں ہو  
 لہذا میں خود ہی تمہاری مدد کے لیے تعاقب میں روانہ  
 ہو گیا تھا۔

”لیکن آئندہ کبھی ہیڈ لائنس سے کھیلنے کی کوشش کی تو۔“

”میرا انسٹن منسوخ کر ادینا۔“ فراز نے ہنستے ہوئے کہا جس کے جواب میں نوید نے اتنا زور دار قہقہہ لگایا کہ بے ہوش ہو گئے۔

”سندھ بھی“ سیدھے کھرچے جانا۔ سمیرا تمہاری منتظر ہوگی کیونکہ تمہارا کوئی پروگرام تھا شاید لیکن اب کہیں اور نہ جانا۔ میرے کمرے میں چوتھے بک شیلف پر چار پانچ سرخ کتابیں پڑی ہیں۔ رات بھر انہیں پڑھنا۔ حج تمہارا انٹرویو ہے لہذا ذوردار تیاری ہونی چاہیے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ صبح کے اخبارات پڑھ کر انٹرویو بورڈ کے افسر خض رسی طور پر تمہارا انٹرویو لیں گے“ چلو۔“

فرازِ خوشی سے بے قابو ہو کر بوڑھے سے لپٹ گیا۔ پھر جب کاربیل کی طرف جا رہی تھی تو اس کی شیکسی کارخ بھلن امارتسنس کی طرف تھا جہاں اس کی زندگی اس کا انتظار کر رہی تھی۔



گیا تھا اور اسے بھی شک ہو گیا تھا کہ کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ لیکن فرماؤ نے نیکی نہیں روکی بلکہ کان پینٹل پر لگاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کہہ رہے ہو کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔“  
 بگ کے جھکے یا وہ اس کے کان سے فریب ہو  
 کر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسی لمحے فراز نے بریک پر  
 پیر رکھ دیا۔ اس سے بل کے بگ کو احساس ہوتا فراز نے  
 وہی ہاتھ پکڑ لیا جو بگ نے پینٹل پر رکھا تھا۔ اس نے  
 جلدی سے مجرم کا ہاتھ اپنی طرف تھینٹ بگ کو ایک  
 جھٹکا لگا اور یو الود فرائز کی گود میں گر گیا۔ کیسی کی رفتار  
 کم ہونے لگی اور پھر وہ ایک طرف رک گئی۔

اسی وقت دوسری کار بھی آ کر رک گئی۔ نوید کسی  
نوجوان کی طرح کود کر نیکی کی طرف لپکا اور فراز کو یہ  
دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ نوید کے ہاتھ میں بھاری  
ریوا اور چمک رہا ہے۔ نوید نے نیکی کا عقبی دروازہ  
کھولا اور پھر چند لمحے بعد گدگد کو ہتھکڑیوں سمیت کار  
میں ڈال دیا گیا۔

فراز نے جس وقت بریک لگائے تھے تو بگ کا سر پینل سے ٹکرایا تھا اور یہ ٹکراتی شدید تھی کہ بگ فوراً بے ہوش ہو گیا تھا۔

”کیا تم بھی اس کے سا بھی ہو؟“ نوید نے اپنی مسرت چھپاتے ہوئے مصنوعی غصیلے لہجے میں پوچھا۔  
”کیا مطلب؟“ فراز نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے اپنا تعاقب کرنے پر مجبور کرنے کے لیے ہیڈ لائنس کئی بار جلائی بھائی تھی تاکہ تم مجھے پکڑوانے کے لیے پیٹرول کار کو اطلاع کرو اور اس دوران میں اس شخص کی گرفتاری کے لیے کوئی منصوبہ تیار کر سکو۔“

”لیکن تم اپنی کار وہیں روک سکتے تھے۔“

”ہاں اور اس کا مطلب یہ ہوتا کہ بگ کے ہاتھوں مزید تین چار افراد کا خون کرا دیتا۔“ فرائز نے



عثمان زکریا ایک اونچی پشت والی کرسی پر سکون سے براہمان تھا اور اس کے سینے میں ایک قلم تراش چاقو دتے تک بیوسٹ تھا اس کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں اور ان میں حیرت سمٹ کر نمودار ہو گئی تھی اس کے عقب

میں نے اس پر ایک اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی اس کی آنکھوں میں تسخّر جھلک رہا تھا۔  
 ”لوگوں کا خیال ہے کہ میں نے اس بڑھے کو قتل کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

اور عین اسی وقت میں اس منظر میں شامل ہوا تھا۔“ میں بول مڑا۔ انیکٹ خاموش رہا تو میری ہمت

نے دریافت کیا۔  
 ”میر نہیں جانتا۔“



ریسورٹھلایا اور چند لمحوں تک دوسری جانب سے کی جانے والی گفتگوں کو مجھ سے مخاطب ہوا۔

”نعمان کا پورا نام نعمان بابا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ آس پاس ہی کہیں ہماری ناک کے عین نیچے موجود

ہے۔“ پھر خاموشی سے گفتگو سننے کے بعد اس نے ریسپورر دکھائی۔ ”اچھا تو پرویز! پس منظر یہ ہے کہ نعمان کو کورٹ سے دس سال تک کی سزا سنائی گئی تھی جس میں سے اس نے پانچ سیال کاٹے تھے۔ اس نے حسابات میں کوئی گڑبڑ کی تھی اس کے مالک نے اسے مجرم قرار دیا اور قانونی معاملات کی مکمل پیروی کی تھی، تم

اس کے جبر کو تو جانتے ہی ہو گے؟“  
 ”عثمان زکریا؟“ میں نے دریافت کیا۔  
 اس نے تائید یا تردید کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنا  
 بیان جاری رکھا۔ ”اس کا مالک کنوارا تھا بظاہر اچھا  
 انسان نہیں تھا۔ نعمان شادی شدہ ہے لیکن اس کی  
 بیوی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے  
 ان لوگوں نے اس کا اتنا کھودیا ہے۔“

”کیا تمہیں نعمان کا حلیہ معلوم ہوا؟“  
 ”ہاں۔ عمر پینتیس سال، قد پانچ فٹ دس انچ،  
 جسم موٹا پے کی طرف مائل، بے حد جذباتی، بھورے  
 ہوتے ہوئے بال، جگہ جگہ گنے پن کے نشانات، کیا  
 ان خواتین نے ایسا کوئی شخص تو نہیں دیکھا تھا؟“  
 ”انہوں نے صرف ایک ایسے شخص کی پشت دیکھی

”میں نے جواب دیا۔  
اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جب میں گھوم پھر کر  
مکان کا جائزہ لے رہا تھا تو انسپکٹر میرے پاس آیا۔  
”میں اس کیس میں تم سے کام لینا چاہتا ہوں۔“  
اس نے کہا۔

”فریحہ کی نگرانی کرنے والے سیاہی نے ابھی ابھی

رکھ دیتا ہوں سو اس وقت بھی میں نے ایسا ہی کیا اور انگلی کے ذریعے پیکٹ کا ایک کونہ پھاڑ کر دیکھا تو اندر سے چند زیر جاعے، قیص، ایک سبزی مائل بھجوریا کیپ

اور ایک پینٹ شرٹ برآمد ہوئی۔ یہ بات طے تھی کہ پینٹ شرٹ ڈھیلا ڈھالا ہوگا چنانچہ میں نے اسے نہیں چھیڑا پھر میں نے تھوڑی سی دروازہ زانی کی۔ دروازہ کھل گیا میں نے بآہستگی کو اڑھکھولتے ہوئے پیکٹ کو ہلکی ٹھوکر رسید کر کے کمرے میں پہنچا دیا اور خود بھی داخل ہو کر دروازہ بند کر کے مڑا تو ایک بڑا سا کلٹ رینالور میری جانب اٹھا ہوا تھا اور اس کے عقب میں دو کینہ پرور غلظا نکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

”میں نہیں جانتا تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔“ میں نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

وہ ایک ہٹا کٹھا شخص تھا، طویل قد و قامت سر کے بال سنہرے اور جگہ جگہ سے اڑے ہوئے اس کی آنکھوں کا تاثر ایسا تھا گویا اس کا ریوالبور کسی بھی لمحے شعلہ اگل سکتا ہے۔

”تم کون ہو؟ پولیس؟“ اس کی آنکھیں مجھے برچھی کی مانند اس جسم میں پیوست ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

”میں ایک نجی سراغ رساں ہوں۔“ میں نے مضطرب ہو کر کہا۔ ”میں تم سے عثمان کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں شبہ اتر آیا۔ ”اس کے بارے میں کس قسم کی گفتگو کرنا چاہتے ہو؟“ ”کیا تم نعمان بابا ہو مجھے تمہاری بیوی نے بھیجا ہے۔“ جواب میں وہ پھنکارا اور ریوالور کو انگلیوں پر گردش دینے لگا۔ ایک ایسے شخص سے صبر و تحمل کی توقع فضول تھی جو مختلف راستوں میں خون کی ہولی

کھیلتا رہا ہو۔  
”ریوا اور رکھ دو“ میں نے ہدایت کی۔ ”تم جیل سے فرار ہو کر بڑی مصیبت میں مبتلا ہو چکے ہو۔“



جواب میں اس کے ہتھ پھولنے اور پچکے لگے اور میری دھڑکنیں بے ربط ہو گئیں۔ اب صرف اس کی دھتکی رک پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت تھی۔ ”تمہارے اور عثمان کے درمیان کیا معاملات تھے؟“

”تم بہت زیادہ بولتے ہو۔“ وہ غرایا۔ ”اگر میری بیوی نے تمہیں بھیجا ہے تو..... خیر تم گھوم جاؤ۔“

میں رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا، دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ اس کی ہدایت پر عمل کیا جائے، کوئی بھی غلط حرکت میرے سینے میں جان لیوا سوراخ کر سکتی تھی میرے کانوں سے اس کے محتاط قدموں کی آواز نگرانی جو لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آتی جا رہی تھی پھر جونہی میرے دل میں فطری طور پر پلٹنے کی خواہش جاگی، اگلی ہی ساعت ریوالور کا دستہ میرے سر پر پڑا اور نہ جانے وہ خواہش کہاں کھو گئی۔ صرف اتنا یاد رہا کہ فرش میری نگاہوں میں الٹ گیا ہے۔

ہوش آیا تو میں نے خود کوریبوں سے بندھا ہوا پایا لیکن بندشیں نرم تھیں۔ شاید یہ فرض بڑی غلت میں سرانجام دیا گیا تھا میں نے ریبوں سے آزاد ہو کر اپنے سر کے ایک مضروب حصے کو ٹٹولا تو آنکھوں کے سامنے پچھڑیاں سی چھوٹی محسوس ہونے لگیں، میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا کہیں کہیں خشک غذا کے کاغذ بکھرے ہوئے تھے شاید جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ اپنے ساتھ کوئی سامان لے کر نہیں آیا تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹچلی منزل کا رخ کیا اور کھولی کے ذمہ دار کی اطلاعی ٹھنٹی بجائی چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور ایک شمارا لودہ چہرے نے باہر جھانکا۔

”اوپری منزل کے تیسری کھولی میں کون رہتا ہے؟“ میں نے پوچھا لیکن وہ تعاون کرنے والوں میں سے نہیں لگتا تھا چنانچہ میں نے ریوالور کی نال اس چہرے میں داخل ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں سو جی ہوئی تھیں گالوں کی رنگت اڑی ہوئی تھی پیشانی زخمی تھی اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایسا لگتا جیٹیں تھم گئیں۔

میں کمرے میں داخل ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں سو جی ہوئی تھیں گالوں کی رنگت اڑی ہوئی تھی پیشانی زخمی تھی اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایسا لگتا جیٹیں تھم گئیں۔

میں کمرے میں داخل ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں سو جی ہوئی تھیں گالوں کی رنگت اڑی ہوئی تھی پیشانی زخمی تھی اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایسا لگتا جیٹیں تھم گئیں۔

تھا جیسے کسی کے باز نے اس کے منہ پر جی بھر کر گھونٹے برسائے ہوں۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ میں نے کہا۔

”جو کچھ بھی ہوا، بہت بُرا ہوا۔“ وہ آستین سے ناک سے بہتا ہوا خون پونچھ کر بولی۔

”ایک شخص آیا تھا غالباً اسے مجھ پر ثریا کا مغالطہ ہوا ہوگا، میں نہیں جانتی کہ یہ سب کیا ہے۔ اس نے آتے ہی مجھ پر کے برسانے شروع کر دیئے ساتھ ہی فحش گالیاں بھی دینے لگا۔ میں بے ہوش ہوتے ہوتے پکی..... پھر وہ چلا گیا۔“

”کیا اس کا حلیہ اس شخص سے مشابہ تھا جسے تم نے عثمان کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر فرار ہوتے دیکھا تھا؟“

”ہاں.....“ وہ اپنے بازو کی خراش پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر کر بولی پھر ایک جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ وہی تھا۔“

”تم نے پولیس کو کیوں طلب نہیں کیا؟“

”میں بے حد خوف زدہ ہوئی تھی وہ ایک قاتل ہے اور میں تنہا تھی۔“

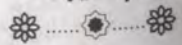
”اگلی بار اس سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخنا اس معاملے میں تم کافی تجربہ کار لگتی ہو۔“ میں نے کہا اور وہاں سے نکل کر نیچا آیا۔

”کیا تم اس وقت سے اب تک یہیں موجود تھے جب میں یہاں سے رخصت ہوا تھا؟“ میں نے نگرانی سپاہی سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”مجھے شک ہے،“ میں نے اسے گھڑتے ہوئے کہا۔

”میری نگاہیں ہمیشہ صحیح مقام پر مرکوز رہتی ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”آئندہ کسی حسینہ کا تعاقب نہ کرنا، ورنہ ہو سکتا ہے تمہیں شینڈیوٹی پر لگا دیا جائے۔“



جب میں عثمان زکریا کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو ثریا ایک کرسی پر کٹمی سمٹائی تھی اس کی رانیں پیشانی پر بکھری ہوئی تھیں اور انسپکٹر انگشت شہادت سے اس کی جانب اشارہ کر کے کچھ کہہ رہا تھا میری آہٹ سن کر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔

”اوہ تو یہ تم ہو۔“ اس کے چہرے پر برہمی چھائی ہوئی تھی۔ ”یہ جو یہاں فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”کہاں.....؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”یہ نہیں بتاتی ہمارے ایک سپاہی نے اسے احمد آباد کا کنٹ خریدتے ہوئے پکڑا ہے۔“

ثریائے اپنا چہرہ میری جانب گھمایا جس پر دہشت پھیلی ہوئی تھی۔

”میں..... میں..... خوف زدہ ہوں، میں قتل ہونا نہیں چاہتی۔“ وہ خوف سے ہکلائے لگی۔

”بس یہ اس وقت سے یہی جملہ دہرائے جا رہی ہے۔“ انسپکٹر نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

”ممکن ہے یہ سچ کہہ رہی ہو۔“ میں نے خیال آرائی کی۔ انسپکٹر جواب میں غرایا۔

”ادھر آؤ۔“ اس نے چند قدم آگے بڑھا کر اس کا سوٹ کیس کھول دیا یہ ایک پرانا اور عام سا سوٹ کیس تھا جسے وہ کبھی اپنے شہر احمد آباد سے لے کر یہاں آئی تھی۔

”دیکھو اس سوٹ کیس میں کیا لے کر فرار ہو رہی تھی۔“ انسپکٹر نے سوٹ کیس کی جانب اشارہ کیا۔

میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں سوٹ کیس کی کئی ٹوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

”دو لاکھ!“ انسپکٹر متمتاتے ہوئے چہرے سے بولا۔ میں نے اسے نعمان بابا سے اپنی ملاقات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔



”میرا خیال ہے کہ وہ واپس آئے گا“ خصوصی طور پر اس شے کے حصول کے لیے جس کی اسے تلاش تھی۔“ میں نے کئی نوٹوں کی جانب اشارہ کیا۔

”ہم شکار کو قابو میں کرنے کے لیے مزید چارہ ڈالیں گے۔“ انسپکٹر نے کہا اور ملازمہ کی جانب مڑا۔ ”مسز رویا!“ اس کا لہجہ نرم تھا۔ ”تم جاسکتی ہو اپنی سہیلی کے ساتھ ٹھہرنا۔“

وہ بادل خواستہ انھی اس کے نشست چھوڑنے کا انداز اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا وہ سرتا پاسہمی ہوئی تھی۔ انسپکٹر نے اپنے ماتحوں کو بلا کر جلدی جلدی صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر ہم تریا کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ وہ کسی جانب دیکھے بغیر اپنی سہیلی فریجہ کی کھولی کی سمت بڑھ رہی تھی اور ہم شکاریوں کی مانند اس کا تعاقب کر رہے تھے وہ فریجہ کی کھولی میں داخل ہو گئی اور ہم بڑک کے اس پار رک کر انتظار کرنے لگے یہ انتظار کافی طویل ثابت ہوا۔ آدھی رات کے وقت ایک نیکیسی رینگتی ہوئی کر موڑ پر رکی کوئی شخص اندر سے اچھل کر برآمد ہوا اور سیدھا کھولی میں داخل ہو گئی۔

”تم نے کچھ دیکھا؟“ انسپکٹر بے چین ہو کر بول پڑا۔ اس کی سانس تیز چلنے لگی تھی۔ ”سبزی مائل بھورا ہیٹ اور بھورے رنگ کی پینٹ شرٹ۔“ وہ طمانیت سے غرایا۔

”ہوشیار رہنا۔“ میں نے تنبیہ کی۔ ”اس کے پاس ایک کوٹ ریوالور ہے اور یہ خاصا جذباتی آدمی ہے۔“ انسپکٹر جواب دیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کھولی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اس کا ساتھ دیا کھولی کے اندر سے گرجنے برسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انسپکٹر نے دروازے پر دستک دی آوازیں ختم گئیں لیکن دروازے تک کوئی نہیں آیا البتہ کھولی کے

عقبی حصے سے فائر کی آواز گونجی۔ ”وہ عقبی زینہ استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ انسپکٹر غرایا۔

میں دروازے پر زور آزمائی کرنے لگا۔ انسپکٹر زور زور سے دروازہ پٹینے لگا۔

”نعمان باہر آ جاؤ تم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہو فرائی کی کوشش بے کار ہوگی۔“ اس نے چیخ کر کہا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ انسپکٹر نے اپنے طاقت ور بازو دروازے پر آزمانے شروع کر دیئے لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا پھر اچانک ہی دروازہ کھل گیا۔ ہمارے سامنے تریا عاصم کھڑی تھی اس کی آنکھیں دہشت سے پٹی ہوئی تھیں اور چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ وا تھے اور وہ ہمیں یوں گھور رہی گویا ہم موت کے فرشتے ہوں اس کے عقب میں نعمان فریجہ کو ڈھال کے طور پر اپنے سامنے تھامے کھڑا تھا اور فریجہ کے شانے کے عقب سے ایک پستول کی نال ہمیں گھور رہی تھی فریجہ کے چہرے پر بے بسی اور خوف کا گہرا امتزاج تھا۔ نعمان اسے دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔

”میں نکل رہا ہوں۔“ اس کی آواز میں غراہٹ اور ختی تھی۔

”بہتر ہوگا کہ ہتھیار ڈال دو یا ہر تمہیں اپنی جانب انھی ہوئی بے شمار رائفلوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور تم ان سے نمٹ نہیں سکو گے۔“ انسپکٹر نے کہا لیکن وہ غیر متزلزل تھا۔

”میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ انسپکٹر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں بھی دروازے کی ایک جانب کھسک گیا۔ فریجہ کے چہرے کی رنگت خوف سے زرد پڑ گئی۔

”اسے جانے دو خدا کے لیے اسے جانے دو۔“ ورنہ یہ مجھے ہلاک کر دے گا۔ یہ زیادہ دور نہیں جاسکے گا۔“ فریجہ گڑ گڑانے لگی۔

”آگے بڑھو۔“ انسپکٹر تاثر سے عاری لہجے میں بولا۔ ”آگے بڑھو۔“

نعمان فریجہ کو اس طرح تھام کر دروازے سے نکلا اور فوراً ہی دیوار سے چپک گیا اس نے فریجہ کو اپنے بازوؤں کے درمیان تھام رکھا تھا۔ اس نے لات مار کر دروازہ کھولا اور چوکنے انداز میں سڑک پر نظریں دوڑائیں اچانک فریجہ اپنے جسم کو بل دے کر اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی نعمان کے ریوالور نے شعلہ اگلا اور دروازے کے شیشے چکن چور ہو گئے اسی افراتفری میں ریوالور نعمان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ میں تیزی سے ریوالور کی جانب لپکا ساتھ ہی وہ بھی لپکا اور ریوالور دوبارہ اٹھانے میں کامیاب ہو گیا لیکن میرا ہاتھ اس کی کلائی پر پڑ چکا تھا اس کا بازو میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے فضا میں اہرایا اور ٹرانسکریپٹر دھکے دے رہا تھا کمرے کا روشن بلب ٹوٹ گیا اور کمرے کے سنائے میں گولی کی آواز دور دور تک گونج گئی۔ کمرہ نیم تاریک ہو گیا میں نے اسے دیوار پر دے مارا انسپکٹر تیزی سے آگے بڑھا لیکن فریجہ نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی اس نے اپنا سینڈل اتار کر اس کی نوکیلی ایڑی سے نعمان کے ہاتھ پر شدید چوٹ لگائی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔

”بہت خوب۔“ انسپکٹر کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس نے بڑھ کر نعمان کا بازو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم سب دوبار کھولی میں جمع تھے نعمان تھکا ہوا اور غصے میں بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ تریا اس

سے ممکنہ حد تک دور ہٹ کر کمرے کے ایک گوشے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”میں تمہیں عثمان زکریا کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں اور مس تریا! جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو جب تک تم ان دو لاکھ کی وضاحت نہیں کرتیں میں تمہیں شریک جرم ہی تصور کروں گا۔“ انسپکٹر مستحکم لہجے میں بولا۔

”بہت خوب۔“ نعمان ہونٹ بھیج کر بولا۔ ”تم مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن تم یہ کیس طرح ثابت کر سکتے ہو میں نے عثمان کو قتل کیا ہے؟“

”تمہارے لباس کے ذریعے۔“ انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔

”اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قاتل یہ نہیں ہے۔“ میں نے مداخلت کی۔ انسپکٹر کی خبیث شکن آلود ہو گئی۔

”نعمان اس وقت تک وہ لباس استعمال نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ تریا لباس اس تک نہ پہنچا دیتی اور میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ انسپکٹر نے آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر ان عورتوں نے آخر کسے دیکھا تھا؟“

”کسی کو بھی نہیں نعمان ٹھیک کہتا ہے اسے اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے ممکن ہے اسے یہ کہہ کر جیل سے فرار ہونے پر آمادہ کیا گیا ہو کہ جو رقم انہوں نے لوٹی تھی وہ عثمان کے فرار ہونا چاہتا ہے۔“

”لیکن جب ہم نے عثمان کو دیکھا تو وہ قتل ہو چکا تھا۔“ فریجہ بول پڑی۔

”اسی جھوٹ کی بنیاد پر پوری عمارت تعمیر کی گئی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ موقع ہی پر ان دو میں سے ایک خاتون کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔“

”نہیں..... نہیں۔“ تریا دہشت سے چیخ پڑی انسپکٹر اس کی جانب بڑھنے لگا۔



# گدش

## شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن، زر، زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک قید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کر دی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری، یہ ہسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جاہلوں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلنا نظر آتا ہے تو کہیں جاہلوں کی دہلیز پر ماتھا ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔

تیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی تیر خیر سلسلے دار کہانی

دروازے بند ہوئے۔ پیچھے سے مسلسل فائرنگ رہی تھی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص جوانی فائرنگ کر رہا تھا پھر ہم فائرنگ کی ریخ سے باہر نکل آئے۔ میری جانب بیٹھے ہوئے دونوں اشخاص میں سے ایک نے مجھے قابو کیا ہوا تھا تو دوسرے نے میرے ہاتھ پشت پر باندھے اور میری تلاش لینے لگا۔ میرا پستول اور پنڈلی سے بندھا ہوا جینز انہوں نے فوراً اپنے قبضے میں لے لیا اور آگے بیٹھے ہوئے شخص کے حوالے کر دیا پھر میری گھڑی موبائل فون اور میرا الٹ سب کچھ انہوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔

تب اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کسی سے موبائل پر بات کی اور کہا۔ ”سر ہم نے اس کو گرفتار کر لیا ہے۔“ ذرا وقفے کے بعد پھر بولا۔ ”جی ہاں ایک بلیک کلر کا بیک بھی ملا ہے۔“ پھر چند لمحے کچھ سننے کے بعد اس نے ”اوکے“ کہہ کر بات ختم کر دی۔

میرا سر انہوں نے سختی کے ساتھ دبا کر میرے گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ میں انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا

اس شخص نے مجھے بری طرح کھینچتے ہوئے گاڑی سے باہر نکالا اور نہایت تیزی کے ساتھ میری تلاش لی۔ اتنے میں پیچھے آنے والی کار سے فائرنگ شروع ہوئی۔ وہ شخص اپنے سر کو جھکاتے ہوئے مجھے لے کر آگے بڑھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے سر کو سختی کے ساتھ نیچے کیا ہوا تھا۔ کاری آڑان کے کام آئی اور وہ اپنی کار کے کھلے ہوئے دروازہ کی جانب بڑھ گئے۔ دوسرا شخص جس کے ہاتھ میں بلیک کلر کا وہ بیک تھا جو اس نے میری کاری فرنٹ سیٹ سے اٹھا یا تھا۔ وہ بھی تیزی سے بھاگتا ہوا دوسری جانب کے کھلے ہوئے دروازے سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس شخص نے مجھے نہایت سرعت سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دھکیلا اور پھر جی سے خود بھی اندر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ تھی اور ڈرائیور الرٹ بیٹھا تھا ایک اور شخص فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔

ہمارے بیٹھے ہی گاڑی تیزی کے ساتھ سیدھی ہوئی اور سڑک پر گویا پرواز کرنے لگی بعد میں

میں چھپادی تھی؟ ایک شہادت بھی ایسی نہیں ہے کہ شریا نے تمہاری جانب دیکھے بغیر کسی بات کی تصدیق کی ہو۔ ذرا اس کی طرف دیکھو اس کی صورت اس بات کی چغلی کھا رہی ہے کہ تم نے اسے کسی سبزی مال بھورے ہیٹ اور ڈھیلے ڈھالے بھورے رنگ کے سوٹ میں ملبوس قاتل کا یقین دلایا تھا۔“

نعمان اپنی جگہ سے اٹھ کر فریج کی جانب بڑھا تو انسپکٹر نے اسے دھکیل کر دوبارہ صوفے پر گرادیا لیکن وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”تم..... تم نے ایسا کیوں کیا.....؟“

”مجھے تم دونوں سے نفرت تھی کیا تم سمجھتے تھے کہ میں تمہارا سات سال تک انتظار کرتی۔“ اس نے نعمان کو نفرت سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”حتی کہ زندگی کی رعنائیاں لوٹنے کا وقت گزر جاتا۔“ اس نے کہا اور شریا کی جانب سفاک نگاہوں سے دیکھا۔

”اس کے دماغ میں تو بھس بھرا ہوا ہے اچھا اب تم لوگ پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ اس کے ہاتھ میں نعمان کا لوٹ ریوالتھا جسے ہم اس سے لینا بھول گئے تھے۔ اچانک انسپکٹر نے بجلی کی سی تیزی سے اس کی کلائی پر ہاتھ مارا اور ریوالتور اس کے ہاتھ سے اڑتا ہوا دور جا کر گرا وہ ریوالتور کی جانب لپکی لیکن انسپکٹر نے اس کا بازو اپنی گرفت میں لے لیا اور یہ گرفت بے حد مضبوط تھی۔ یکایک وہ چیخ چیخ کر رونے لگی شریا بھی اس معاملے میں اس سے پیچھے نہ رہ سکتی وہ ایک بار پھر میٹریائی انداز میں چیختے لگی تھی۔

”خدا کے لیے! انہیں خاموش کراؤ۔“ میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر چیخ پڑا۔

✽

”وہ نہیں..... بلکہ یہ.....“ میں نے فریج کی جانب اشارہ کیا۔ ”تم نے عثمان کو قتل کیا جب تم فلم دیکھ کر واپس آ میں تو تم نے شریا کو سرگوشی میں بتایا کہ کوئی شخص کھڑکی پر موجود ہے۔ شریا جائزہ لینے چلی گئی تو تم نے قلم تراش چاقو اٹھا کر اونگھتے ہوئے عثمان کے دل میں پیوست کر دیا اور شریا کو چیخ چیخ کر آوازیں دینے لگیں وہ ایک سادہ لوح اور جذباتی لڑکی ہے۔ تم نے چیخ چیخ کر اسے اس قدر دہشت زدہ کر دیا کہ وہ تمہاری ہر بات کو حقیقت سمجھ کر اس کی تائید کرتی چلی گئی۔ تم نے اسے یہ بھی یقین دلایا کہ اگر قاتل نے اسے ہلاک نہیں کیا تو پولیس اس پر قتل کا الزام عائد کر دے گی۔ کیا تم نے اس معصوم دوشیزہ کو اپنے شوہر کی اس خفیہ پناہ گاہ میں ان کپڑوں کے پیکٹ کے ساتھ نہیں بھیجا تھا جو اس نے اس وقت پہن رکھے ہیں اور جس کا ذکر تم نے اس کا حلیہ بیان کرتے وقت کیا تھا پھر تم نے اسے خوف زدہ کر کے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس شہر سے فرار ہو جانا ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔“

”تمہاری باتیں محض بکواس ہیں۔ یہ مجرم میرا شوہر نہیں ہے۔“ فریجہ غصے سے چیختی۔

”تمہارا کیا خیال ہے نعمان؟“ میں نے نعمان سے پوچھا وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

نعمان مجھے ضرب لگا کر بے ہوش کرنے کے بعد یہاں آیا تھا۔ تم نے قتل کی رات ایک اجنبی کو کس طرح اپنے مکان میں داخل ہونے کی اجازت دی تم سڑک پر کھڑی ہو کر اتنی بلنداؤں میں چیخ سکتی ہو کہ تمہاری چیخ کئی ہلاک تک سنی جاسکتی ہے لیکن ایک اجنبی آ کر تمہیں زد و کوب کرتا ہے تو تمہارے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکلتی اس نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا..... کیا اس رقم کی بنا پر جو تم نے شریا کے سوٹ کیس



لیکن ان کی آوازیں بخوبی سن سکتا تھا اور پھر ایک کپڑا میری ناک سے لگا کلو و فارم کی تیز بو میرے تھنوں سے نکل رہی تھی اور میں دنیا و فیہا سے بے خبر ہو گیا۔

اس سے پہلے میں صرف ایک بات سوچ رہا تھا کہ ”آج میرا چمک ختم ہو گیا۔ میرے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں خود کو ان لوگوں کے اور حالات کے سپرد کر دوں۔ فون پر ہونے والی گفتگو سے لفظ گرفتار سن کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ابجنی والوں کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔ میرا کیا انجام ہونے والا ہے میں جان بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ اس وقت میری حالت کچھ ایسی ہو رہی تھی جیسے کوئی پتھر پانی والے بحرِ خود کو بے بسی سے موت کے حوالے کر دیتا ہے کیونکہ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور چارہ جو نہیں ہوتا لیکن شاید میرا حال اس سے بھی برا ہونے والا تھا پھانسی کی تکلیف اٹھانے کے بعد بندہ ہر دکھ اور اذیت سے آزاد ہو جاتا ہے لیکن تفتیش کے سلسلے میں میرے اوپر تشدد کے پہاڑ ٹوٹنے والے تھے یہ لوگ بندے کی زبان پر فوری طور پر یقین بھی تو نہیں کرتے۔

مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو زنجیروں میں قید پایا۔ نہ میرے ہاتھ آزاد تھے اور نہ پاؤں۔ حد یہ کہ میری گردن میں بھی زنجیر پڑی ہوئی تھی البتہ زنجیریں اتنی بڑی تھیں کہ میں زمین سے اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔

میں نے بمشکل اپنے جسم کو سمیٹا اور گھسیٹ کر دیوار سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ بری طرح چکر آرہے تھے اور پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کمرے میں چھت کا پنکھا موجود نہیں تھا البتہ پنکھا لٹکانے کا ہک موجود تھا۔ بلب موجود تھا لیکن آف تھا۔ کیونکہ اب دن نکل آیا تھا اور سورج کی تیز روشنی سے ہلکی ہلکی روشنی اس کمرے میں آ رہی تھی۔ گویا میں ساری رات بے ہوش رہا ہوں۔

اس وقت کیا نام ہو رہا تھا اس کا مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ دوپہر تھی یا شاید سہ پہر۔ میری گردن سختی کے ساتھ نیچے جھکے رہنے کی وجہ سے بری طرح درد کر رہی تھی۔ یہی حال ہاتھوں اور ٹانگوں کا تھا۔ ہاتھ تو نجانے کتنے گھنٹوں سے پشت کی جانب مڑے ہوئے تھے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے کندھوں کے جوڑا بکھل جائیں گے میں جب ہوش میں آیا تھا تو مڑی تڑی حالت میں تھا ٹانگیں بھی مڑنے کی وجہ سے سن ہو رہی تھیں۔ ایک حیرت انگیز بات اور میں نے محسوس کی کہ بھڑا جڑہ بہت بری طرح سے دکھ رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد آیا تھا میرے چہرے پر تو کسی بھی قسم کی ضرب نہیں لگی تھی۔ پھر جڑہ کیوں دکھ رہا ہے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کو دیر تک چیرے ہوئے رکھا گیا ہے۔ پھر میں نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ میرے اپنے کپڑے جینز کی شرٹ اور جیکٹ میرے جسم پر نہیں تھی شاید بے ہوشی کی حالت میں میرا لباس تبدیل کیا گیا تھا اس وقت میں ایک پاجامے اور بنیان میں ملوس تھا۔

مجھے چند انسانی قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر چند افراد اندر آئے تو میں نے ان سے گزارش کی کہ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ مجھے پانی دیا جائے لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے میری آواز ان کے کانوں میں نہیں آ رہی ہے۔ وہ میرے نزدیک آئے اور انہوں نے میرے دونوں پاؤں زنجیر میں لگے کڑوں میں علیحدہ علیحدہ جکڑ دیے۔ اس کے بعد ہاتھوں کی رسیاں یا زنجیریں جو بھی تھیں وہ کھول دیں اور دونوں کلائیوں پر پچھلے سے آگے کر کے زنجیروں میں لگے جھکڑی نما کڑوں میں علیحدہ علیحدہ باندھ دی۔ پھر ایک شخص آپا اور اس نے ایک پیالے میں مجھے پینے کے لیے پانی دیا۔

میرے پاؤں اور ہاتھ میں کڑے تھے وہ جن زنجیروں سے بندھے تھے ان کے سرے فرش میں گڑے ہوئے تھے اور میں ٹانگوں کو پھیلا اور فولد کر سکتا تھا اور ہاتھوں میں پڑے کڑے دیوار میں گڑی زنجیروں میں لگے ہوئے تھے اور ان میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ میں سر جھکا کر کھانسیں کر سکتا۔

وہ شخص جو میرے لیے پانی لے کر آیا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے اتنا تو بتا دو کہ میں کن لوگوں کی قید میں ہوں اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ تو وہ بولا۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم ابھی افسر لوگ یہاں آئیں گے تمہیں جو کچھ بھی پوچھنا ہو ان ہی لوگوں سے پوچھنا۔ میں تمہارے ساتھ اتنی ہمدردی کر سکتا ہوں کہ تم تائب کر دو کہ وہ تم سے جو کچھ بھی پوچھیں اس کا بالکل سچ جواب دینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اپنے لیے ہی بہتر کرو گے ورنہ سچ اگلوانے کے لیے ان لوگوں کے پاس بہت بھیاں تک طریقے ہیں اور جب وہ تم پر وہ طریقے آزمائیں گے تو تم سچ بولنے پر مجبور ہو جاؤ گے لیکن پھر کیا فائدہ اس وقت تک تمہارے جسم کی ہر ہڈی ٹوٹ چکی ہوگی اور اس انداز سے ٹوٹے گی جو ساری زندگی جڑ نہیں سکے گی اور تم ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاؤ گے۔ نہ کبھی اپنے پاؤں پر چل سکو گے نہ اپنے ہاتھوں سے کچھ کھانسیں سکو گے۔ اتنا تو ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ تم مسلمان ہو جب تمہارے کپڑے تبدیل کیے جا رہے تھے تب ہمیں معلوم ہو گیا تھا دوسرے تمہارے سارے دانتوں کو بھی چیک کر لیا گیا ہے۔ تمہارا کوئی بھی دانت یا داڑھ یا سینا نیڑ نہیں ہے۔ مسلمان ہو کر مسلمانوں کے خلاف کام کرتے ہوئے انسان۔“ اتنا کہہ کر اس نے ایک زور دار بات میرے منہ پر ماری اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کی بات میرے جڑے پر بہت زور سے لگی

تھی۔ اس کے جوتے کی نوک میرے رخسار اور ناک کو بھی رگڑتی ہوئی چلی گئی تھی مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا لیکن میں نے اپنی آہ کو اپنے اندر ہی دبایا اور سوچا یہ تو کچھ بھی نہیں آگے اس سے زیادہ بہت کچھ ہونے والا ہے۔

یہ تھوڑا سا وقت جو مجھے ملا تھا میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ لوگ پاکستان آرمی کی ابجنی والے ہوئے تو میں انہیں ہر بات بالکل سچ بتا دوں گا اور یہ بھی کہہ دوں گا کہ میں نواب کا دوست نہیں اس کا دشمن ہوں اور اس کے راز جاننے کے لیے اس کے لیے کام کر رہا تھا تا کہ زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کر سکیں لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ وہ لوگ میری ہر بات سننے کے بعد میری اس بات کا یقین بھی کر لیں کہ میں نواب کا وفادار کتا نہیں ہوں اور ”را“ کے لیے کام نہیں کر رہا۔ میں انہیں قاری ممتاز اور کل راؤ کے بارے میں بھی بتاؤں گا اور دہلی سے آنے والے بڑے مین رئیس خان کے بارے میں بھی بتاؤں گا۔ کاش یہ لوگ میری اس بات کا یقین کر لیں اب مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ میرے فلیٹ پر آنے والے یہی لوگ تھے پیارے بھی ان ہی کا بندہ تھا۔ میں نے اپنے بندھے ہوئے اور لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہاتھوں اور پیروں پر ایک نگاہ ڈالی اور خود ہی اپنی حالت پر مسخر سے ہنس دیا۔ ”لو بھئی شیر بھی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ اے ڈاکٹر شاہ زمان تو یہ ہے تمہاری آخر..... تم نے اور تمہارے ماں باپ سمیت چھوٹے بھائی اور بہن نے تمہارے لیے کیا کیا سنے سجائے تھے اور تمہارا انجام کیا ہو رہا ہے۔ شاید یہی کہ ایک دن تمام اخبارات کی اور نیوز چینلز کی یہی سرخیاں ہوں گی کہ ایک خطرناک دہشت گرد شہرِ رومانی جو انڈیا کی تنظیم را کے لیے پاکستان میں رہ کر کام کر رہا تھا آج







بتایا کہ میں قاری ممتاز کے پاس بھی ایک لفافہ لے کر گیا تھا تو وہ چیخ اٹھا اور میں بولتے بولتے رک گیا۔

”کیا تم اتنے ہی معصوم اور احمق ہو کہ تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوا کہ نواب تمہارے ذریعے کس کے پاس کیا چیز بھجوا رہا ہے اور کوئی عام آدمی کبھی اپنی پہچان کو ڈور وڈ کے تبادلے کے ساتھ نہیں کرواتا۔“

”مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہاں تھوڑی بہت نہیں بلکہ کافی ساری گڑبڑ ہے لیکن میں نواب کے کام اسی لیے کرتا رہا کہ اس طرح مجھے اس کے بارے میں ساری معلومات مل جائیں گی اس کے روابط کن لوگوں سے ہیں اور یہ کیا کرتا ہے میں نے اس بات کی اطلاع ایک نیوز چینل کی اینکر اور مشہور صحافی جناب طلال عمر صاحب کو بھی دینی چاہی لیکن میرے بار بار فون کرنے پر بھی ان لوگوں نے فون نہیں اٹھایا۔“

میری بات سن کر وہ بری طرح چونک پڑا اور بولا۔

”تم ان لوگوں کو کیسے جانتے ہو کیا ان سے تمہاری پرانی واقفیت ہے۔“

جواب میں میں ایک بار پھر شروع ہو گیا میں نے ہر بات اسے بتا دی۔ کرمل مشاق سے ملاقات حشام کے زخمی ہونے والا معاملہ پھر رئیس بیگ سے ملاقات اور آخر میں کل راؤ کے پاس جانے والا واقعہ۔ وہ پوری خاموشی اور توجہ سے میری باتیں سنتا رہا پھر تیزی کے ساتھ روم سے نکل گیا پھر تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اور بولا۔

”تم نے بہت اچھی کہانی گھڑی ہے یہ سب کچھ جھوٹ اور بکواس ہے۔ میں نے تمہیں ایک موقع دیا تھا لیکن تم نے یہ سمجھا کہ تمہارے سامنے دنیا کا احمق ترین انسان بیٹھا ہے۔ جو تمہاری ہر بات کو سچ مان لے گا۔ اپنے دماغ سے اس خیال کو جھٹک دو کہ تم مجھ سے سچائی کو چھپا سکتے ہو میں تمہیں صرف ایک موقع

اور دینا چاہتا ہوں میں آج کی تمام رات تمہیں سوچنے کا موقع دینا چاہتا ہوں۔ کل اگر تم نے دورانِ تفتیش غلط بیانی کی یا کچھ چھپانے کی کوشش کی تو پھر تمہارے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“

”آپ میری بات کا یقین کریں سر میں خود نواب کا دشمن ہوں اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا اس کی وجہ سے میرا پورا گھرانہ تباہ و برباد ہو گیا۔ میں آپ کو کس طرح سے یقین دلاؤں۔ میرا جرم صرف یہ ہے کہ میں نے نواب کا کھوج لگانے کے لیے اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس کا ساتھ دیا تھا لیکن میں اس کا حامی اور دوست نہیں ہوں۔“ میں نے احتجاج کے انداز میں کہا۔

”جب اپنی گردن میں پھندا فٹ نظر آتا ہے تو خود انسان مظلوم اور دوسرا ظالم دکھائی دیتا ہے ابھی تمہارے لیے کھانا اور پانی بھیجا جا رہا ہے۔ چائے اور سگریٹ کی طلب ہو تو وہ بھی دے دی جائے گی۔ واش روم جانا ہو تو وہاں بھی جاسکتے ہو لیکن کل..... کل کے بعد تم سے یہ ساری مراعات لے لی جائیں گی۔ دیکھو اپنے ملک کے ان دشمنوں کو بچا کے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ کیوں ان کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا رہے ہو۔ سچ سچ سارے لوگوں کے نام اور ٹھکانے بتا دو اور اپنی جان چھڑاؤ۔“ اس نے کہا۔

”میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتایا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یار تمہاری سوئی وہیں کیوں انکی ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر وہ شخص کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد روشن خان میرے لیے کھانا لے کر آ گیا۔ ایک پلیٹ میں روٹیاں اور دوسرے میں سالن تھا پھر اس نے میرے ہاتھوں کی زنجیر تھوڑی سی

دراز کردی جس کی وجہ سے میں نے با آسانی کھانا کھا لیا اس نے چائے اور سگریٹ کا پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلادیا ذرا دیر بعد وہ یہ دونوں چیزیں بھی لے آیا پھر میری خواہش پر کہ مجھے واش روم جانے کی حاجت ہو رہی ہے تین سیخ افراد اندر آ گئے ایک نے میرے ہاتھوں اور پیروں کی زنجیروں کو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور مجھے واش روم میں بھیج کر دیوار کی سائیڈ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ تینوں بھی الارٹ کھڑے رہے پھر مجھے دوبارہ اسی کمرے میں واپس لے جا کر میرے ہاتھ اور پیروں کی زنجیروں کو زمین اور دیوار میں نصب ہوئے کے کڑوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔

پیٹ میں خوراک گئی تو میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور کبھی کا سنا ہوا وہ محاورہ سچ ثابت ہونے لگا کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

وہ رات نہ جانے کون سا پہر تھا جب کھٹ پٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ کمرے میں اس صبح والے شخص کے علاوہ ایک دوسرا آدمی بھی ہے۔ میرے بے دار ہونے کے بعد وہ نیا آنے والا شخص مجھ سے مخاطب ہوا اس کا لہجہ بہت کرخت تھا۔

”تم نے میرے آفسیروں کو جو بیان دیا ہے وہ محض کو اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ البتہ تمہاری ایک دو باتیں سچ بھی ہیں۔ اب یہ ان کی غلطی یا پارحمدی ہے کہ انہوں نے تمہیں حقیقت اگلنے پر مجبور نہیں کیا۔ ہم تم جیسے غدار وطن کی ناز برداریاں نہیں کرتے اور نہ انہیں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ ہمیں احمق تصور کرتے ہوئے کچی جھوٹی کہانیاں سناتے پھریں اور ہم ان فضول کہانیوں پر یقین کر لیں۔ اب اس بات کا فیصلہ میں کروں گا کہ تمہارے بیان میں کتنی صداقت ہے۔ اگر تم نے میرے آگے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو ابھی اور اسی وقت تمہیں تمہارے

جھوٹ کی سزا مل جائے گی۔“

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں سر کہ میں نے جو کچھ پہلے بتایا تھا یا اب بتاؤں گا وہ سب سچ پر مبنی ہوگا۔ کیا آپ میری اس بات کا یقین کریں گے کہ میں اپنی اس گرفتاری سے نہ تو پریشان ہوں اور نہ فکر مند ہوں بلکہ میں تو اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ میں مل راؤ عرف اشرف علی نامی شخص کے پاس ایٹمی پلانٹ کا نقشہ لے کر نہیں پہنچ پایا۔ میں تو دل میں اللہ سے دعا کر رہا تھا کہ کاش کوئی ایسا قابل اعتبار شخص ہو جس پر اعتبار کر کے میں نواب سطوت کے اس سیاہ کر توت سے اسے آگاہ کر سکوں اور اللہ نے میری دعا سن لی اور آپ لوگوں کو بھیج دیا۔ میرے وطن کی حرمت بچ گئی۔ میرے پاس ایک یو ایس بی میں نواب کے خلاف اور بھی بہت سے ثبوت ہیں وہ میں آپ کے حوالے کر سکتا ہوں۔“

”ہم گزشتہ ایک سال سے تمہیں واپس کر رہے ہیں۔ تم بہت عرصے سے ہماری نگاہوں میں ہوا چھا یہ بتاؤ کہ صوبائی وزیر مذہبی امور مولانا سہیل ہاشمی کا مرڈم نے کیا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے سر جھکائے دھیمے لہجے میں اقرار جرم کیا۔

”کس طرح؟ اور کس کے کہنے پر؟“

میں نے اس کی بھی تمام تفصیلات اسے بتا دیں میری بات سننے کے بعد وہ تملاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک زوردار ٹھوکراپنے جوتے کی نوک سے میرے سر پر مارتے ہوئے دھاڑا۔

”سارے غیر انسانی کام انجام دیتے رہے کس کے لیے..... کس خدا کو راضی کر رہے تھے..... لعنت ہو۔“

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔



پھر وہ جیسے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے جوتے کی نوکیلی نوک سے جس پر شاید فولادی پتری چڑھی ہوئی تھی مار مار کر میرا حشر برا کر دیا۔ اس کے بعد میری آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔ میرا دماغ بے جان ہونے لگا۔ مسلسل میرے سر پر ضرب پاشی کی گئی۔ اسی وجہ سے درد بڑھتے بڑھتے جیسے ہر احساس مٹ گیا۔ شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو کمرہ ان لوگوں کے وجود سے خالی تھا۔ دن نکل آیا تھا آنکھوں کی دھند آہستہ آہستہ ہٹ رہی تھی۔ سر کسی کپے ہوئے پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ میں نے سر کر ذرا سا ہلایا تو کانوں میں عجیب طرح کی شانیں شانیں کی آوازیں آنے لگیں۔ میری نگاہ میرے بنیان پر پڑی جہاں خون کی بوندوں کے نشانات تھے شاید یہ خون میری ناک سے پڑا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میرے لیے ناشتہ آیا چائے اور ڈبل روٹی تھی لیکن میں نے ناشتے کی جانب دیکھا تک نہیں مجھے شدید چکرا رہے تھے۔

”کھا لو تاکہ میں تمہیں درد کو دور کرنے والی گولیاں دے سکوں“ ناشتے کے بعد وہ کھالینا سر کا درد کم ہو جائے گا کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو صاحب لوگ جو کچھ پوچھ رہے ہیں وہ سب کچھ سچ سچ کیوں نہیں بتا دیتے۔“ روشن خان نے کہا تو میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم کسے بچانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس نے میرے نزدیک جھکے ہوئے کہا۔

”میں کس طرح انہیں اپنی سچائی کا یقین دلاؤں کہ میں نے ایک ایک لفظ بالکل سچ سچ کہا ہے۔ میں کسی کو بچانے کی کوشش نہیں کر رہا بلکہ دل سے چاہتا ہوں کہ ان دشمن عناصر کو گرفتار کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”اچھا تم ناشتہ کر کے یہ گولیاں کھا لینا درد میں کمی آجائے گی۔“ اس نے گولیوں کا پیکٹ ٹرے میں رکھا اور چلا گیا۔

میں نے بہت ہمت کر کے ناشتا کیا اور گولیاں کھالیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں انہیں اپنی سچائی کا کس طرح سے یقین دلاؤں صرف اللہ کی ذات ایسی ہے جو اگر رحم کرے تو انہیں میری بات کا یقین آجائے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اللہ مجھ جیسے گناہ گار اور سیاہ کار پر کیوں رحم کرے گا۔ پھر خود ہی اپنے اس خیال کو رد کر دیا کہ اللہ ان گناہ گاروں پر ضرور رحم کرتا ہے جو اس کی جانب پلٹ آتے ہیں اس کے آگے روتے اور گڑگڑاتے ہیں اس سے معافی اور مدد مانگتے ہیں بس اس خیال کے آتے ہی میں اس حالت میں زمین پر سجدے کی حالت میں آ گیا۔

حالانکہ میرے دونوں پاؤں پھیلے ہوئے تھے ہاتھ جدا جدا تھے۔ سر زمین تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھا دیے اور اللہ کے آگے فریاد کرنے لگا۔

”یا ارحیم الرحیم! میں تیرا بے حد گناہ گار بندہ تیری رحمت کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ اے مالک میرے گناہ بہت زیادہ ہیں لیکن تیری بے شمار رحمت ہے جو ہر شے پر چھائی ہوئی ہے اے میرے رب تو رحمان ہے رحیم ہے کریم ہے مغفور ہے ذو الجلال واکرام ہے تو دلوں کے مجید سے خوب واقف ہے۔ انسان کی نیت اور ارادے کو بھی خوب پہچانتا ہے اے میرے اللہ تو بے حد و بے حساب صفات کا مالک ہے۔ تیری ذات وصفات میں کوئی بھی ذرہ برابر بھی شریک نہیں ہے اپنے محبوب ہمارے قاسم کا ردو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں مجھ پر رحم فرما اللہ اگر تو نے مجھ پر رحم نہ کیا اور مجھے معاف نہ کیا تو

میں دنیا اور آخرت میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میرے جانے اور ان جانے اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما دے میری مدد فرما مجھ پر اپنا رحم کر۔۔۔۔۔

مالک کرم کر۔۔۔۔۔ میرا تیرے سوا کوئی مالک و معبود نہیں اگر تو نے میری مدد نہیں کی اور مجھ پر اپنا فضل نہ کیا تو میں اور کس کے در پر جاؤں گا۔ یا رب رحم فرما کرم فرما اے میرے رب میرے مالک۔۔۔۔۔ رحم فرما۔

میں روتا رہا۔ گڑگڑاتا رہا اور پھر میرے بے تحاشا بہتے ہوئے آنسو جیسے تھم گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اپنا دست شفقت میری پشت پر رکھ دیا ہو۔ میرا چہرہ اور گریبان میرے آنسوؤں سے بھیک گیا تھا۔ میرے دل کو ایک عجیب طرح کا سکون اور طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔ آج اور اس لمحے مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میں تنہا نہیں ہوں اللہ کی رحیم و کریم ذات میرے ساتھ ہے۔ پھر ایک بار پھر آنکھیں موند کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

آہٹ پر میں نے آنکھیں کھولیں میرے سامنے ایک نیا آفسر موجود تھا۔ اس نے نسبتاً نرم لہجے میں مجھ سے بات کی۔ میں نے اس مرتبہ کہانی کا آغاز اپنے گاؤں سے کیا۔ وہ چپ چاپ خاموش بیٹھا میری گفتگو سنتا رہا۔ ٹیپ ریکارڈ بھی آن رکھا تھا۔ درمیان میں اس نے مجھ سے کئی سوالات کیے میں نے ابھی تک نواب کے کہنے پر جتنے کام کیے تھے سب کچھ بتا دیے۔ میری گفتگو میں آغا قزلباش کا نام بھی آیا اس آفسر نے چند اجنبی نام بھی میرے سامنے لیے کہ میں ان سے کسی بھی طور واقف ہوں۔ کبھی ان کو نواب کی کوئی میں آتے جاتے دیکھا ہے یا کسی کے منہ سے ان ناموں کو سنا ہے اس پر میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ جواب میں وہ خاموش رہا۔ اس نے مجھ سے کرنل مشتاق لطال انکل حشام اور سرمئی کی بابت بھی

سوالات کیے جن کے میں نے تسلی بخش جوابات دے دیے۔ مجھ سے گفتیش کرنے کے بعد وہ آفسر چلا گیا۔ اور اللہ کے فضل و کرم سے اس رات مجھے ان زنجیروں سے آزاد کر کے ایک اور روم میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں کوئی کھڑکی اور روشن دان موجود نہیں تھا۔ صرف ایک دروازہ اندر آنے جانے کے لیے تھا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا واش روم تھا جس کی چھت بہت اونچی تھی۔

اور ایک فٹ کا روشن دان موجود تھا۔ کمرے میں ایک تین فٹ چوڑائی اور چھ فٹ لمبائی کا بیڈ تھا پنکھا بھی تھا اور بلب بھی۔

یہاں آ کر میں نے اللہ کا لاکھ شکر ادا کیا اور روشن خان سے کہا کہ وہ مجھے ایک جائے نماز اور قرآن پاک لا کر دے دے۔ نجانے کیوں اب مجھے اپنی موت کا بھی خوف نہیں رہا تھا۔ میں نے نواب کے بارے میں ساری انفارمیشن دے دی تھی۔ ذہنی طور پر میں بے حد پر سکون تھا۔ اب اگر مجھے میرے جرائم پر موت کی سزا بھی دی جائے گی تو میں خوشی خوشی قبول کر لوں گا۔

روشن خان میری فرمائش پر مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا ہوا چلا گیا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ میری مطلوبہ چیزیں لے آیا میرے چہرے پر پھیلا اطمینان دیکھ کر وہ حیرت سے بولا۔

”کیا واقعی تم دہشت گردوں کے ساتھی نہیں ہو؟“

”میں نے جرائم کیے ہیں میرے بھائی! میں کب ان کا انکار کر رہا ہوں لیکن اس ابن ابلیس کے ساتھ میں اس لیے تھا کہ اس کے ساتھ رہ کر اس کے بارے میں جان سکوں۔ وہ ایک بہرو پیہ ہے۔ بد معاش ہے دوسروں کے سامنے اس نے شرافت کا نقاب پہن رکھا ہے اور لوگ اسے ایک روحانی عامل مانتے ہیں۔



میں نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی۔ انسانی  
میسجائی کا سوچا تھا لیکن اپنی کم علمی کی بناء پر میں  
مصیبت پڑنے پر غلط فیصلے کرتا چلا گیا۔ قرآن میں  
میں نے پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ”مصیبت  
کے وقت صبر اور نماز سے کام لو۔ کہیں کہہ رہا ہے  
شیطان تمہارا اھلا دشمن ہے۔“ ان باتوں کا شعور تو مجھے  
جب آ تا جب میں نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہوتا۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا میں شیطان اور اس کے  
پیروکاروں کا شکار ہو گیا۔ برائی کے رستے پر چل نکلا  
اور یہ سوچتا رہا کہ میں کچھ اچھا کرنے جا رہا ہوں لیکن  
میرا الحام بہت بھیانک نکلا۔

پورے تین دن تک میرے پاس کوئی بھی تقش  
کے لیے نہیں آیا مجھے پابندی سے دونوں وقتوں کا کھانا  
اور صبح کا کھانا ناشتا ملتا رہا۔ پتا نہیں وہ لوگ میرے  
بارے میں کیا سوچ رہے تھے کون سی میٹنگز کر رہے  
تھے یہ بھی ممکن تھا کہ میری دی ہوئی معلومات کی روشنی  
میں وہ دوسری کارروائیوں میں مصروف ہوں۔ البتہ  
میں نے اپنی پوری توجہ نماز اور قرآن کی جانب  
مہذول کر رکھی تھی۔ نماز کے بعد گڑ گڑا کر اللہ کے  
حضور توبہ کرتا اور پھر قرآن کو ترجمہ کے ساتھ پڑھنے  
اور سمجھنے میں مصروف ہو جاتا۔

وہ سہ پہر کا وقت تھا میں نماز ظہر سے فارغ ہو کر قرآن پڑھنے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔ پورے انہماک سے سورۃ آل عمران کا ترجمہ پڑھ رہا تھا تب ہی بہت سارے لوگوں کے تیز تیز چلنے کی آواز آئی پھر میرے روم کا دروازہ کھلا تو میں نے اپنی نگاہیں دروازے پر لگا دیں کد اب کون آیا ہے مجھ سے باز پرس کرنے کے لیے اور جو لوگ اندر آئے انہیں دیکھ کر میں بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میرے منہ سے تیر زدہ لہجے میں نکلا۔

اگست 2013ء عید مبارک، عید مبارک، عید مبارک

میری آنکھ کھلی تو آنٹی عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔  
 میں اتنی گہری نیند سوئی تھی کہ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا  
 کہ یہ کون سا وقت ہے آنٹی کو نماز پڑھتے دیکھا تو سوچا  
 کہ شاید فجر کا وقت ہے۔ لیکن کھڑکی سے سورج  
 کی ہلکی سی مدہم روشنی آرہی تھی۔ تب یاد آیا کہ عصر کا  
 وقت ہے۔ میں دوپہر کے کھانے کے بعد آنٹی کے  
 پاس آکر لیٹی تھی کہ میری آنکھ لگ گئی۔ طلال انکل  
 حشام کے کمرے میں تھے اس سے کچھ ضروری باتیں  
 کر رہے تھے اور انہوں نے جان بوجھ کر مجھے وہاں  
 سے بھیج دیا تھا۔

”تم نماز پڑھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“

”ہاں پہلے انہوں نے تمہیں بلایا تھا لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ تم سو رہی ہو تو انہوں نے تمہیں جھانے سے منع کر دیا۔“ آنٹی نے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔

پچاسا کھنگھار کراپنے آنے کا احساس دلایا تو اس نے

”آپ نے تو ہمارے بغیر چائے پی لی۔ اب ہمیں اکیلے پینا پڑ رہی ہے۔“ میں نے کپ کو منہ سے لگا کر ایک سب لیتے ہوئے کہا۔

”ارے میری جھوٹی چائے ہے۔“ میں نے کہا۔  
”تو کسا ہوا“ کہتے ہیں جھوٹا کھانے سے محبت

”توبہ ہے حشام تم بھی کس زمانے کی باتیں کر رہے ہو انکل! بوڑھوں والی یہ سب رانے وقتوں کی

”بھئی پیار و محبت کی باتیں اگر ہزاروں سال  
رانی جہاں گونا تیرے بھی پہنچیں، انہیں اس طرح سے

”کمال سمجھ رہا ہے، ایک شکریہ کہ“

دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں نہ جانے کیا

یہی دیکھ رہا ہوں؟ اس نے بجائے جواب دینے کے الٹا سوال کر ڈالا۔







میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ اس نے کہا اور تنکے پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور میری جانب سے کروٹ لے لی۔

”نہیں میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو پلینز حشام میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو پلینز مجھ سے یوں منہ نہ موڑو۔“ میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے تم سے ناراض ہونے کی تمہاری لائف تمہاری ہی ہے نا تم جس طرح چاہو گزارو جو چاہو کرو میرا کیا ہے میں دوبارہ کسی

نادیدہ ہاتھ کی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا اور اس مرتبہ تمہیں بھی فرصت نہیں ہوگی کہ میری زندگی کے لیے دعا کرو کیونکہ تمہیں تو بڑے بڑے معرکے سر کرنے ہیں بس کہانی ختم ہو جائے گی۔“

اس نے اس طرح کروٹ لیے لیے لیٹے کہا اور میں اپنی جگہ بیٹھی رہی میرا دماغ سنسنار ہا تھا جسم میں جیسے جان ختم ہو گئی تھی۔

حشام میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں کراہ کر رہ گئی۔ چاہ رہی تھی کہ اس کی باتوں کے جواب میں کچھ کہوں لیکن ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ میری دماغی

کیفیت عجیب طرح کی ہو رہی تھی۔ ایک شدید قسم کی کشمکش میرے اندر ہو رہی تھی۔ میں اپنے مشن سے بھی پیچھے ہٹنا نہیں چاہ رہی تھی اور حشام کی ناراضی بھی

برداشت نہیں کر سکتا تھا حشام اگر میری لائف میں نہیں ہے تو سرمئی کی زندگی بھی باقی نہیں رہے گی۔ مجھے تو اپنی سانسوں کی ڈور حشام کی سانسوں کی ڈور کے ساتھ بندھی محسوس ہوتی تھی۔

اور پھر میرے اندر یہ کشمکش اتنی زیادہ بڑھی کہ میں برداشت نہ کر سکی۔ میں دونوں میں سے کسی کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی نہ حشام کو اور نہ ہی اپنی صحافی

ذمہ داریوں کو۔ میرا مقصد تھا نواب سطوت جیسے اور

دوسرے معاشرے کے ناسوروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا۔ ان میں سرفہرست میرا باپ نواب سطوت تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ نواب سطوت میرے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچے اور تب میں اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاؤں اور بڑے تفاخر سے کہوں۔

”مجھے غور سے دیکھو میں ہوں سرمئی روشن آرا اور نواب سطوت کی بیٹی جس کی کوششوں سے آج تم اپنے انجام کو پہنچے ہو۔“

”حشام..... حشام..... شامی..... جا..... نو..... پلینز مجھ سے ناراض مت ہو۔ میں اسے دھیرے دھیرے پکار رہی تھی لیکن مجھے دیا ہوا خطاب وہ اپنے

اوپر سجا کر بیٹھ گیا تھا۔ کھڑور بن گیا تھا میں اسے کہہ سکتے ہوئے پکار رہی تھی۔ یہ وہ الفاظ اور لہجہ تھا جو کبھی میں نے اس کے سامنے نہیں ظاہر کیا تھا آج میں اپنی

ساری انا اس کے قدموں میں ڈھیر کر کے اسے پکار رہی تھی لیکن اس نے جواب بھی دیا تو کہا۔

”پلینز جاؤ سرمئی تمہیں آزادی ہے چلی جاؤ۔“ اور پھر میرا سر بری طرح چکرانے لگا ایسا لگا جیسے

کمرے میں گھناٹا پ اندھیرا اچھا گیا ہو۔ ہوا شائیں شائیں کر کے میرے پاس سے آ جا رہی ہو اور پھر کہیں پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ میرا جسم بری

طرح لرزنے لگا اور میں کرسی سے چکرانی ہوئی نیچے گر پڑی۔

مجھے ہوش آیا تو سب میرے گرد جمع تھے حشام آنٹی طلال انکل اور ڈاکٹر ذیشان میں نے آنکھیں کھول کر خالی خالی نگاہوں سے سب کی جانب

دیکھا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں کیوں بیڈ ریلیٹی ہوں اور سب پریشان اور فکر مند چہرہ

لیے میرے گرد جمع ہیں۔ سر میں درد ہو رہا تھا اور مجھے بے حد کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

سب سے پہلے حشام تیزی سے میری جانب بڑھا اور میرے اوپر جھکے ہوئے بولا۔

”اب کیسا فیل کر رہی ہو سرمئی کسی طبیعت ہے؟“ ”مجھے کیا ہوا ہے؟“ اف میرا سر بہت درد ہو رہا ہے۔ میں نے کمزور اور نحیف لہجے میں کہتے ہوئے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔

”کچھ نہیں ہوا ہے تمہیں لگتا ہے حشام کی خدمتیں کر کر کے تھک گئی ہو اور اب اپنی خدمت کروانے کا دل چاہ رہا ہے۔“ ڈاکٹر ذیشان نے نرمی سے حشام کا

بازو پکڑ کر اسے میرے پاس سے ہٹایا اور قریب آ کر منکراتے ہوئے بولے۔

میری نگاہیں حشام کے چہرے پر تھیں۔ وہ بے حد پریشان تھا آنکھوں میں مجھے پانی اور فکر مندی دکھائی دے رہی تھی۔

”حشام۔“ میں نے دھیرے سے اسے پکارا۔ ”مجھے اس وقت کسی کی بھی فکر نہیں تھی کہ میرے نزدیک کون کون کھڑا ہے۔“

”بولو میری جان۔“ حشام بھی سب کی پروا کیے بغیر تڑپ کر آگے آیا اور بولا۔

”تم مجھ سے ناراض ہو۔“ میری آنکھوں میں حشام کا روٹھا روٹھا چہرہ آ گیا تو وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

”کوئی بات ہوئی تھی تم دونوں کے درمیان۔“ طلال انکل نے پہلے حشام پھر میری جانب دیکھا اور تیزی سے بولے۔

ہم دونوں ہی خاموش تھے اور بس خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ تب ہی آنٹی نے کہا۔

”ناؤ بیٹا چپ کیوں ہو تم نے سرمئی سے کچھ کہا تھا۔“ آنٹی نے حشام کی جانب دیکھتے ہوئے

قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

”اس کی یہ حالت یوں ہی تو نہیں ہوگئی۔ ضرور تم نے کوئی ایسی بات کی ہے جس سے میری بیٹی کو بہت تکلف پہنچی ہے۔“ آنٹی باقاعدہ حشام پر غصہ کرنے لگیں۔

”میرا خیال ہے آنٹی سرمئی اب ٹھیک ہے بس ذرا کمزوری ہے۔ ہمیں ان دونوں کو تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔ ان کا آپس کا کوئی معاملہ ہے یہ خود ہی سلجھا لیں گے۔“ ڈاکٹر ذیشان نے جب حشام کو شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے دیکھا تو بولے۔

”سوچ لو حشام اگر سرمئی کو کچھ ہوا تو میں تمہیں کبھی بھی معاف کروں گی۔ تمہیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ جتنے دن تم نے اسپتال میں گزارے

میں سرمئی نے وہ دن کی اذیت میں گزارے ہیں اور اتنا پیار کرنے والی تو نصیبوں سے ملتی ہے اور تم نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے اگر روشن بہن کو یہ

سب پتا چلا تو میں کیا جواب دوں گی انہیں بولو..... جواب دو..... چپ کیوں کھڑے ہو؟“ آنٹی حشام کو ڈانٹ رہی تھیں۔

”مئی بانی گاڈ میں نے سرمئی سے ایسا کچھ نہیں کہا۔ یہ تو بس ویسے ہی۔“ بلا خر حشام نے ہر جانب سے اٹھنے والی غصیلی نگاہوں اور تیز و تند جملوں سے گھبرا کر زبان کھولی۔

”شاید۔“ وہ لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔ ”شاید نہیں حقیقت میں، میں نے سرمئی کو بہت زیادہ پریشان کیا ہے مسلسل ذہنی اذیت اور پھر بابا کا انتقال ان سب چیزوں نے مل کر اس کو کمزور کر دیا ہے اور یہ شدید ذہنی

تھکاوٹ کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی ہے۔“ ”یہ سب تم مجھے مت سمجھاؤ میں تم سے زیادہ اس بات کو جانتی ہوں تمہیں تو کچھ پتا بھی نہیں ہوتا تھا۔“

”یہ سب تم مجھے مت سمجھاؤ میں تم سے زیادہ اس بات کو جانتی ہوں تمہیں تو کچھ پتا بھی نہیں ہوتا تھا۔“

نذر افق 97 اگست 2013 عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نذر افق 96 اگست 2013 عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک











شخص سے باتیں کر رہے تھے۔

پہلے ایک موٹر سائیکل سوار باہر نکلا پھر بلیک سوک  
نکلی اس کے پیچھے دوسرا موٹر سائیکل سوار بھی نکل گیا۔  
ان سب کے جانے کے بعد گیٹ کو بند کر دیا  
گیا۔ اندر دو افراد اسلحہ سنبھالے موجود تھے جبکہ آصف  
یہاں سے پیچھے کی جانب بنے ہوئے زینے کی  
جانب بڑھ گئے جو سیدھا ٹاپ فلور تک جاتا تھا۔ پھر  
انکل بھی اندر آ گئے۔

سیکیوری کا اتنا سخت انتظام ہے یہ بات مجھے آن  
معلوم ہوئی تھی۔ صورت حال سنگین ہے یہ تو مجھے  
معلوم تھا لیکن اتنی زیادہ سنگین ہے اس کا اندازہ مجھے  
حشام کے کمرے میں ہونے والی گفتگو کو سن کر ہوا تھا۔  
بہت سی اہم باتیں تھیں جن سے مجھے انجان رکھا

گیا تھا۔ اس وقت میری سمجھ میں بہت کچھ آرہا تھا  
حشام کا کل شام والا رویہ اس کا مجھ سے ضد کرنا کہ میں  
گھر بیٹھ جاؤں اور ہمارے ملک میں کیا کیا ہو رہا ہے  
حشام کے بارے میں میرے اوپر ایک اور بے حد اہم  
انکشاف ہوا تھا جس کی آج تک حشام نے مجھے ہوا  
بھی لگنے نہیں دی۔ بظاہر حشام ایک عام صحافی تھا

ایک معروف نیوز چینل کا نمائندہ لیکن دراصل اس کا  
تعلق ملک کے ایک اہم حساس ادارے سے تھا۔  
آج مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا تھا کہ حشام اپنے  
ادارے کے لیے یہ خدمت پچھلے کئی سالوں سے  
انجام دے رہا تھا۔ میری نگاہ میں وہ ایک عام شوخ  
کھنڈر اسامحبت کرنے والا انسان تھا لیکن اندر سے  
وہ ولادی اعصاب اور نہایت عقل فہم کا مالک تھا۔

شہروز بھائی پر ان لوگوں کی پہلے دن سے ہی نگاہ تھی۔ وہ شروع سے ان کے لیے مشتبہ تھے۔ ان کے علاوہ خفیہ ایجنسی کی انتہائی اہم رپورٹ جو حشام نے مرتب کی تھی اس میں بہت اہم ملکی شخصیات کو بے نقاب کیا گیا تھا دو کا تعلق حکومت میں شامل افراد سے تھا۔ جن کے براہ راست تعلقات موساد اور راءالوں کے ساتھ تھے۔

نواب سہتوں کا نام ان کے ساتھ لازم و ملزوم تھا۔ اس کے اعلیٰ سطح تک تعلقات تھے اور وہ ان لوگوں سے پیسے لے کر ملکی مفاد کے خلاف کام کر رہا تھا شہر و بھائی بھی محض اس کے آلہ کار تھے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہروز بھائی اس وقت  
ایجنسی کے قبضے میں ہیں اور ان سے نفیث کے سلسلے  
میں جو باتیں معلوم ہوئیں ان کی اچھی طرح چھان  
بین کر لی گئی ہے انہوں نے اپنے بیان میں ایک لفظ  
بھی جھوٹ نہیں کہا تھا۔

جن لوگوں کی انہوں نے نشاندہی کی تھی وہاں چھاپے مارے گئے لیکن شہر و بھائی کے اغوا ہوتے ہی سب انڈر گراؤنڈ ہو گئے البتہ ایک اہم شخص جو دہلی سے آیا تھا رئیس خان نامی وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن اس کے ساتھ آئی ہوئی اس کی بیوی جس کا قیام ایک ہوٹل میں تھا اسے ان لوگوں نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔

یہ بات بھی کلیئر ہو چکی تھی کہ حشام پر جان لیوا حملہ  
ریس خان کی ایما پر کیا گیا تھا اور اس کام میں نواب  
سلطو ملوث تھا چند اور اہم لوگ بھی ان کے ہاتھ  
لگے ہیں جنہوں نے بہت اہم انکشاف کئے تھے۔

یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی کہ حشام کا تعلق  
خفیہ ایجنسی سے ہے لیکن کسی طرح سے یہ بات نواب  
سلطنت یار میں خان کے علم میں آ گئی خیال یہ ظاہر کیا

جار ہاتھا کہ ہمارے نیوز چینل کے ہیور چیف رمضان صاحب بھی کسی طور ان کے اہل کار بن چکے تھے۔ شاید حشام کے بارے میں انہوں نے ہی بتایا تھا۔

رمضانی صاحب کو بھی کرفار کر کے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا تھا اور ہمارا نیوز چینل بند کر دیا گیا ہے۔ میں تو صرف حشام کے گرد ہی اس کی صحت یابی کو لے کر فکر مندی سے گھومتی رہی اور مجھے کسی بات کا پتا ہی نہیں چلا۔

شہروز بھائی کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ شہروز بھائی نواب سبط کے ساتھ صرف اس لیے تھے کہ وہ اپنے طور پر شاید اسے سزا دینا چاہتے تھے لیکن وہ گناہ گار تو تھے۔ ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جانا تھا اس کا فیصلہ ابھی نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ایک طرح کی جیل میں تھے ان کے قبضے میں تھے اور باہر کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

نواب سطوت بھی غائب تھا۔ دہلی میں بھی اس کو تلاش کیا گیا لیکن وہاں بھی اس کی موجودگی کے شواہد نہیں ملے خیال یہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ رئیس خان اور نواب سطوت ایک ساتھ ہی فرار ہوئے ہیں۔

سر جانی ٹاؤن میں خفیہ ایجنسی کے بندے اس کے روحانی سینٹر گئے تھے لیکن وہاں موجود بندوں نے وہاں کے بارے میں عالمی کا اظہار کیا تھا اور بشکل روحانی سینٹر کی تلاشی لینے دی البتہ اس کی کوٹھی پر چھاپہ لگا کر چند بندوں کو گرفتار کیا گیا ہے وہاں سے کئی خواتین بھی لی گئیں جن میں تین خواتین غیر مسلم تھیں۔ ایک ہندو اور دو خواتین یہودی تھیں۔ شہر و عائی کے روم کی بھی تلاشی لی گئی اور ان کی چھپائی ہوئی ایس بی ای کے نشاندہ پر یہ حاصل کر لی گئی ہے۔

کرنل مشتاق اور وہ اجنبی شخص جس کو انہوں نے

اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے آواز کی سمت کان لگا دیئے آواز دھیمی تھی کوئی بہت محتاط ہو کر بول رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کرمل مشتاق کی آواز ہے۔

کرمل مشتاق اور رات کے اس وقت حشام کے روم میں میں نے حیرت سے سوچا۔

پہلے سوچا کہ یہیں سے پلٹ جاؤں کیونکہ چھپ کر کسی کی باتیں سننا اور تجسس کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

لیکن جب کرنل مشتاق کے منہ سے شہروز بھائی کا نام سنا تو میں سب کچھ بھول گئی اور پوری توجہ سے اندر ہونے والی گفتگو سننے لگی۔

اندر سے جوتا وازیں مجھے آ رہی تھیں ان میں حشام،  
طلال انکل اور ایک اجنبی آواز شامل تھی۔

میں دم سادھے ان لوگوں کی ساری گفتگو سنی رہی اور جب ان لوگوں نے اٹھ کر جانے کا اعلان کیا تو میں تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی اور اس روم میں آگئی جہاں میں سو رہی تھی۔

میں نے دروازہ ایک بار پھر لاک کیا اور اندھیرے میں کھڑکی کھول کر باہر گیٹ کی جانب دیکھنے لگی۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے طلال انفل کے ہمراہ انفل کرٹل مشتاق اور ایک نوجوان لڑکے کو گیٹ کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ کار پورچ میں بلیک کلر کی سوک کھڑی تھی آصف بھی کار کے پاس کھڑے کار کے اندر بیٹھے ڈرائیونگ سیٹ والے







آئیں گے۔ تمہیں پتا ہے مجھے تمہاری آٹنی کو اور اس گھر کے درود پوار کو تمہاری پیاری سی نبی تمہاری آواز سے تمہارے چلنے پھرنے کی سرسراہٹوں کی عادت سی ہوگئی ہے۔ تم یہاں تھیں تو بہت رونق تھی اور ہم اب اس رونق کو اپنے گھر لانے میں دیر نہیں کریں گے۔“

انگل نے اتنے پیار سے یہ باتیں کیں کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا شدت سے جی چاہا کہ میں انگل کی محبت کے جذبات لیے دل دھڑک رہا ہے۔ سر رکھ دوں اور اپنی ہر آرزو ہر حسرت کو اپنے آنسوؤں کے ذریعے باہر نکال دوں کہ مجھے ایک باپ مل گیا ہے۔ سر کا بھی تو وہ محترم رشتہ ہے جو بھی نہیں ٹوٹ سکا۔ چاہے عورت بیوہ ہو جائے یا طلاق ہو جائے وہ شخص جو اس کا سر رہ چکا ہے وہ ہمیشہ کے لیے ناخرم ہو گیا۔

لیکن ابھی انگل میرے سر نہیں بنے تھے۔ اس لیے میں نے ان سے فاصلہ قائم رکھا۔ انگل بولتے رہے اور میں سنتی رہی۔ روشنی اب پوری طرح پھیل چکی تھی۔ سورج نے اپنا رخ روشن زمین کی جانب کر لیا تھا۔ تب میں نے آٹنی اور زینب بوا کو آتے ہوئے دیکھا۔ زینب بوانے چائے کی ٹرے تھام رکھی تھی اور آٹنی ان کے پیچھے پیچھا آ رہی تھی۔

”میں نے سرمئی کے روم میں جھانکا وہاں نہیں تھی تو میں سمجھ گئی کہ تم یقیناً لان میں اپنے انگل کے ساتھ ہو گئی۔ اس لیے یہیں چائے لے آئی۔“ آٹنی نے نزدیک آ کر کہا اور ہم لان میں یکجہی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ درمیان کی ٹیبل پر زینب بوانے ٹرے رکھ دی اور میں چائے مگ میں نکال کر انگل کو دینے لگی۔

زینب بوانا شتابانہ کے لیے چلی گئی تب انگل نے میرے جانے کے بارے میں آٹنی کو بتایا تو وہ

تھوڑے پس و پیش کے بعد مان گئیں۔ میں نے ایک بات نوٹ کی کہ جیسے انگل خود چاہ رہے تھے کہ میں اب گھر واپس چلی جاؤں وہ ایسا کیوں چاہ رہے تھے۔ یہ بات بعد میں میری سمجھ میں آ گئی تھی اور مجھے اس سے بھی بڑی حیرت ہوئی جب میں نے اپنے جانے کا ذکر حشام کے سامنے کہا تو وہ بھی بڑی جلدی مان گیا لیکن میں نے اس بات کا برا نہیں منایا اور سمجھ گئی کہ ضرور اس کے پیچھے کوئی بات پوشیدہ ہے۔ جس طرح کل رات میں نے کرنل مشتاق کو رات میں یہاں آتے دیکھا اور ان کی باتیں سنیں ہو سکتا ہے اسی سلسلے میں کچھ اور ہونے والا ہے اور انگل اور حشام نہیں چاہتے کہ میں یہاں موجود رہوں۔ انہیں اس بات کا علم نہیں تھا۔ میں ان کے بہت سے راز جان چکی ہوں۔

میں نے اپنا سارا سامان پیک کیا اور جانے کے لیے تیار ہو گئی تب آٹنی نے بھی مجھ سے ویسی ہی باتیں کیں جیسی انگل نے صبح لان میں کی تھیں۔

میں کارپورچ میں آئی تو کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں نے آصف کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ سلام کی رکی کارروائی ادا کرنے کے بعد میں پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ میری نگاہیں اندر کی جانب تھیں۔ جہاں حشام کھڑے تھے میں نے اپنا دایاں ہاتھ آہستہ سے اوپر اٹھایا تو جواب میں حشام نے بھی ہاتھ اوپر کیا اور تیزی سے اندر چلے گئے میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنا رخ سیدھا کر لیا اور کہا۔

”چلیے آصف۔“ میں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر سر بھی نکا دیا۔ لیکن آصف نے گاڑی آگے نہیں بڑھائی تو میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں کہ کیا وہ ہے کہ آصف نے گاڑی آگے نہیں بڑھائی۔ تب ہی میری نگاہ بیک مرر پر پڑی۔ آصف کی گہری نگاہیں میرے چہرے کا احاطہ

کے ہوئے تھیں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی یہ تیز اور گہری نگاہیں میرے اندر اتر رہی ہیں۔ میں نے ٹھہرا کر اپنی نگاہیں جھکا لیں اور کچھ نہ کہہ سکی تب آصف کی آواز میرے کان میں آئی وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

”کیسی ہیں آپ؟ بہت دنوں بعد دکھائی دی ہیں۔ خاصی کمزور لگ رہی ہیں۔ لگتا ہے حشام کی دل سے تیمارداری کی ہے۔“ مجھے ان کے لہجے میں ہلکے سے طنز کی جھپن محسوس ہوئی اس لیے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

”آپ کیوں ڈرائیو کر رہے ہیں آپ کو ہمیں رہنا چاہیے میں ڈرائیو کر کے ساتھ چلی جاتی۔“

”میں ہی تو ہوں آپ کا ڈرائیو اتنی جلدی بھول گئیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ اتر آیا۔

”نہیں..... وہ..... میرا مطلب تھا کہ آپ کی تو یہاں ڈیوٹی لگی ہے نا۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔

”وہ ڈیوٹی بھی پاپا نے لگائی تھی اور یہ ڈیوٹی بھی پاپا نے لگائی ہے اور پھر جو ڈیوٹی بندے کو دل سے پسند ہو اس پر تو وہ خوشی سے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔“ آصف نے بدستور مجھے اپنی نگاہوں کی گرفت میں لیے ہوئے کہا میری نگاہیں ایک لمحہ کے لیے بیک مرر کی جانب اٹھیں پھر جھک گئیں۔ میں ان کے لفظ پاپا کہنے پر چونک گئی کہ ان کا اشارہ کس کی جانب ہے وہ کس کو پاپا کہہ رہے ہیں۔

”پاپا کون پاپا؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔“ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”کرنل مشتاق اور کون وہی تو ہیں میرے پاپا اور انہوں نے پہلے ہی دن سے آپ کی سیکوریٹی کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔“ اس نے بھی اس بات پر حیرت کا اظہار کیا گویا کہہ رہا ہو کہ تعجب ہے تم کو یہی نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔

”آپ مشتاق انگل کے بیٹے ہیں حیرت ہے مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ ان کی سیکوریٹی ایجنسی میں شامل ہوں گے۔“

”اگر یہ بات آپ کو پہلے بھی معلوم ہوتی تو اس سے کیا فرق پڑ جاتا آپ کی نگاہوں میں میری حیثیت تبدیل ٹھوڑی ہو جاتی۔ وہی رہتی جواب ہے جبکہ میں تو.....!“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر گاڑی اشارت کرنے لگا اور پھر بڑی تیزی کے ساتھ گیٹ سے باہر نکال لایا اس نے تیزی سے ہی گاڑی کو ٹرن دے کر روڈ کی جانب لایا اور پھر جیسے گاڑی روڈ پر پرواز کرنے لگی۔ میں نے ایک بار پھر بیک مرر کی جانب دیکھا اس نے حتیٰ کے ساتھ اپنے ہونٹ بھیچے ہوئے تھے اور نگاہیں وینڈاسکرین سے باہر روڈ پر جمی ہوئی تھیں۔

یا الہی یہ کل سے میرے اوپر کیسے کیسے انکشافات ہو رہے ہیں۔ رات حشام کی ذات کے اوپر سے پردے ہٹے تو آج آصف کے بارے میں معلوم ہوا کہ آصف کرنل مشتاق کے بیٹے ہیں۔ آج مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ کرنل مشتاق نے میری سیکوریٹی کی ذمہ داری کو کتنا اہم سمجھا تھا اور اس کے لیے سب سے زیادہ قابل اعتماد انہیں اپنا بیٹا ہی دکھائی دیا میرے دل میں خود بخود انگل مشتاق اور آصف کے لیے ڈھیر ساری عزت اٹھ آئی اور میں نے کہا۔

”آصف میں آپ کی بے حد عزت کرتی ہوں.....!“

”صرف عزت.....!“ اس نے میری بات کاٹ کر تیزی سے کہا اور اتنی ہی تیزی سے ایک دم بیک لگا دیا۔ میں جھٹکے سے آگے کی جانب جھک گئی اور میرے منہ سے بساختہ نکلا۔

”اف۔“ اس نے دوبارہ گاڑی آگے بڑھادی اور



آصف نے کھل کر اس کا اظہار کر دیا تھا۔

ابھی میں آصف کی بات کا جواب نہ دے سکی تھی کہ آصف نے اپنے کان میں لگے چھوٹے سے تار کے ساتھ لگے ایک بٹن کو پیش کیا کسی کی بات سنی اور پھر گاڑی ہوا سے ماتیں کرنے لگی۔

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آپ کو ڈرائیور کیوں سمجھوں گی میں آپ کے بارے میں جانتی ہوں۔“ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیا جانتی ہیں آپ میرے بارے میں؟ میرے دل کے بارے میں.....!“ اس نے پھر اچانک ہی برعکس لگا کر گڑبڑی اور تجھے مڑکھڑکھاتا ہوا۔

میں حقیقت میں سہم گئی تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج اس کو کیا ہو گیا ہے اس کا رویہ اس کی باتیں سب مجھے خوف زدہ کر رہی تھیں۔ پیچھے روڈ پر ٹریفک ہمارے پیچھے رکنا شروع ہو گیا۔ گاڑیوں نے ہارن بجانے شروع کر دیے۔

”پلیز آپ گاڑی چلائیں دیکھیں پیچھے ٹریفک رک رہا ہے۔“ میں نے ایک نگاہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور کہا۔

”نہیں پہلے آپ جواب دیں کہ آپ کیا جانتی ہیں میرے بارے میں، میرے دل کے بارے میں۔“ اس نے کہا اور پھر کسی خیال کے تحت اس نے پھر گاڑی بڑھا دی لیکن اپنی رفتار کا ہستہ رکھی اس نے گاڑی سائیڈ میز پر رکھ کر پچھلے سٹانے والی ٹریفک کو راستہ دیا۔

آصف کی بات سن کر میں شا کڈ رہ گئی۔ یہ آصف نے کس قسم کا سوال کر دیا۔ پہلے بھی کئی مرتبہ مجھے ایسا احساس ہوتا رہا تھا لیکن بعد میں میں نے اس کو اپنا وہ سمجھ کر اس نے ذہن سے جھٹک دیتی تھی۔ لیکن آج

ابھی مجھے آئے ہوئے گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ حشام کا  
فون آ گیا میں اپنے کمرے میں آ گئی میرا کمرہ  
صاف ستھرا تھا ہر شے اپنی جگہ قرینے اور سلیقے سے  
لکھی تھی۔

”سن لی آواز“ اب مجھے امی سے باتیں کرنے  
دیں ہم رات میں باتیں کریں گے۔“ میں نے شوخ  
لہجے میں کہا۔

”اللہ حافظ جانم۔“ حشام نے بھاری لہجے میں کہا۔ ”دعا کرتی رہنا۔“ اور ریسپورچو منے کی آواز آئی اور فون بند ہو گیا۔

”میں تمہارا سر.....! نہیں نہیں یہ میں کیا کہہ رہی ہوں اللہ تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے۔“ میں خود ہی اپنے کہے گئے ہمیشہ اس جملہ کو جو میں حشام کی شوخی

اور پھر واقعی اس رات میں بار بار حشام کو کال کرتی رہی لیکن اس کا فون مسلسل بند رہا تھا۔ کافی دیر تو میں نے انتظار کیا جب اس کا فون نہ آیا تب میں نے ٹرائی کی۔

میں ابھی جاگ ہی رہی تھی کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی میں نے خوشی سے دھڑکتے دل کے ساتھ فون کی جانب ہاتھ بڑھایا کہ حشام کا فون آ گیا لیکن جیسے ہی فون کی روشن اسکرین پر میری نگاہ پڑی تو میں چونک گئی کیونکہ یہاں حشام کا نہیں بلکہ صف کا نام اور نمبر دکھائی دے رہا تھا۔

بیل مسلسل بجتی رہی اور پھر بند ہو گئی میں نے شکر ادا کیا اور سونے کے ارادے سے کروٹ لے لی۔  
 صاف سمجھے ہوں گے میں سو گئی ہوں لیکن مانچ







کراچی  
بی راسا  
ملک کی مشہور  
خاندان

یہی چلو کہی: معروف تصنف اقراء غیر اجمرا کا خوبصورت ملاز میان ناقابل فراموش ناول

جھیل کے ناکھ کنکڑن سماجی رویوں پر مبنی پیرا ورجسٹ گندھی نازک کنو نازاری کا دلکش سلسلہ

کراچی

ہی راسا لے میں ہے جتا پ کے آسوگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے صرف اور صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی کرک لائیں۔

ملک کی مشہور معروف قلم کاروں کے سلسلے وار ناول ناولٹ اور افسانوں سے متوازن ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک

چند ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

عید مبارک عید مبارک عید مبارک 2013ء

”بے بے آخر آپ بتا کیوں نہیں رہیں کون سی خواہش اور مجھے آپ کی کون سی خواہش اچھی نہیں لگتی۔“ سفیان نے زچ ہو کر پوچھا۔

”یات دراصل یہ ہے پتر کہ میری بڑی پرانی خواہش تھی کہ میں غزالہ کو اپنی بہو بنائوں جب تم دونوں چھوٹے تھے اور ساتھ کھیلا کرتے تھے وہ روٹھ جاتی تو اسے متیں کر کے مناتا تھا۔ اس ویلے تم دونوں مجھے بڑے ہی اچھے لگتے تھے اور اس ویلے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ غزالہ کو تیری دلہن بنا کر اپنے گھر کے آگن میں لاؤں گی لیکن.....!“ اتنا کہہ کر بے خاموش ہو گئی انہوں نے تیز اور پھولی ہوئی سانسوں کے دوران یہ سب کہا پھر ذرا سانس لینے کو رکھیں تو سفیان چیخ اٹھا۔

”لیکن کہا بے باغے بولیں، لیکن کیا ہوا؟“  
”بھائی رفیق نے غزالہ کی بات پکی کر دی تیرے  
چاچے کے بیٹے تو صیف کے ساتھ اور میں کچھ بھی نہ  
کہہ سکی۔ اگر اس ویلے مجھے ملوم پڑ جاتا جب تیرے  
چاچے نے یہ بات ڈالی تھی تو میں بھائی رفیق سے  
بات کرتی پھر مجھے تو بلاوا آیا کہ آپاں سی آ جاؤ غزالہ کی  
بات پکی کر رہا ہوں میں اپنا دل موسوں کر رہ گئی.....  
آہ.....“ بے بی کی آواز بھرا گئی اور سفیان اسے تو ایسا  
موسوں ہوا جیسے یہ چھت اس کے سر پر آن پڑی ہو۔  
آسمان چھٹ پڑا ہو۔ زلزلہ آ گیا ہو وہ جوا ہنسی اعصاب  
کا مالک سمجھا جاتا تھا ایک ذرا کی ذرا میں ٹوٹ پھوٹ  
گیا۔ بے بی نے یہ کیسی خبر سنا دی اس کا پیار اس کا  
خواب کسی اور نے چھین لیا۔ اس کا خواب کتنا سچا تھا  
کاش وہ اس رات ہی سفینہ کو فون کر کے اپنے دل کی  
بات بے بی تک پہنچا دیتا تو بے بی چاہے کچھ  
ہو جاتا یہ رشتہ نہیں ہونے دیتیں۔ کیا وہ جی پائے گا  
غزالہ کے بغیر کیا غزالہ جی مائے گی اس کے بنا۔

کہ فون پر بے بے ہی ہوں گی وہی ہمیشہ گھر کے فون سے اس کے موبائل پر فون کر لیتی تھیں۔ ورنہ سفینہ کے پاس تو انما موبائل فون تھا۔

”السلام علیکم بے بے..... کیسی ہیں آپ۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔

”سدا جیتا رہے مینڈا پتر۔ رب سوہنا بمی حیاتی  
وے۔“ بے بے کی ممتا سے بھر پورا آواز سنائی دی۔

”طبیعت کیسی ہے بے باقی گھر میں سب کیسے ہیں؟“ سفیان نے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے پتر میں بھی ٹھیک آں۔“ بے نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اور اداسی بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا بات ہے بے بے۔ مجھے تو آپ آواز سے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ مجھے بتائیے ناکیا بات ہے آپ کو پتا ہے نا بے میں آپ سے کتنی دور ہوں۔ آپ ٹھیک نہیں ہوں گی تو میں اپنا کام تندی سے کیسے انجام دوں گا۔“ اس نے بے چین ہو کر کہا۔

”تو فکر نہ کر پتر۔ ایسی کوئی خاص گل ہمیں اے بس میں تو ایویں پریشان اور دکھی ہوگئی ہوں۔ اصل میں ایک ارمان تھا مدتوں سے میرے دل میں ایسے پتر کے لیے ایک خواب دیکھا تھا وہ سمجھو ٹوٹ گیا۔ پر کیا کریں یہ سارے نصیبوں کے کھیل ہیں مرضی ہے سو نہنے رب دی۔“ بے نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی۔

”کیا ہو گیا ہے بے بے اب بتا بھی دے سچ میں بہت پریشان ہو رہا ہوں۔“ سفیان نے کہا اور بے قراری کے عالم میں ہڈ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”پھر میں سوچتی ہوں کہ چل جو ہوا اچھائی ہو  
ہوگا۔ یہ خواہش بھی تو کلی میری اپنی ہی تھی۔ تیرے  
دل کا مینوں کی بتا۔ اب جانے تجھے اپنی بے بسی  
یہ خواہش اچھی لگتی بھی یا نہ لگتی۔“

وہ پریکٹس کرتا رہا ہے۔ شمرز نے اپنے ماضی کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا انہوں نے اس کی بھی معلومات کروالیں تھیں۔

اس نے شمرز سے نفی کش ممل کر کے اپنی جانب سے رپورٹ بنا کر کرنل احتشام کو بھیج دی تھی اور اس کے بعد کرنل احتشام نے شمرز سے پوچھ گچھ کے لئے دوسرے بندے بھیج دے تھے۔

مسلسل جاگ جاگ کر اس کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ فی الحال اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ رپورٹ بھیجنے کے بعد فی الحال وہ فارغ تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر ایک زوردار انگڑائی لی۔ تاکہ اسے اپنے اکڑے ہوئے اعصاب میں کچھ سکون ملے۔ اس نے اردلی کو کڑک چائے لانے کا کہا اور کچھ دیر کے لیے بیڈ پر سیدھا لیٹ گیا۔ اسے سونے میں کچھ ٹائم تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ چائے پی کر وہ نماز عشاء ادا کرے گا۔ پھر تھوڑی سی تلاوت کرے گا۔ کتنے ہی دن ہو گئے اس نے قرآن کی تلاوت نہیں کی تھی۔ پھر وہ سونے کے لیے لیٹ جائے گا۔ اب وقت ملا ہے تو تھوڑی نیند ہی لے لی جائے۔ کرنل احتشام کا کیا بھروسہ وہ کسی وقت اسے امیر جنسی میں کال کریں۔

وہ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ کر  
چپ لیٹا چھت کو گھور رہا تھا کہ موبائل فون کی رنگ  
ٹون سنائی دی۔

”لو، بھی ابھی سونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کرنل احتشام کی کال آ گئی۔“ اس نے فون اٹھاتے ہوئے سوچا لیکن اسکرین پر گھر کا نمبر دیکھا تو اس کے لب آپ ہی آپ مسکرا دیے اور اسے خیال آیا کہ کتنے ہی دن ہو گئے اس نے گھر فون نہیں کیا۔ اسکرین پر پی ٹی سی ایل کا نمبر دکھ کر ہی وہ سمجھ گیا کہ











## آلشبه مخدوم

پنہومت عبارت ہے شعبہ بازی سے۔ کائنات کے طول و عرض میں آپ کو  
بہانت بہانت کے جوگی ملیں گے، جو بھگون کے نام پر لوگوں کو طرح طرح کے  
شعبہ دکھا کر عروب کرتے نظر آتے ہیں اور ایمان سے محروم سادہ لوح لوگ  
ان کے شعبہوں کو کرامات تصور کر کے انہیں اوتار اور نجانے کیا کیا مراعات دے کر  
اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔

ایک نوجوان کا قصہ، ایک جوگی نے اسے خوف ناک حالات سے دوچار کر دیا تھا

تھی۔ اسے پونا پہنچ کر کسی ہوٹل ہی میں ٹھہرنا تھا۔ جہاں وہ رات گزارتا اگلے دن صبح اس نے لوگوں سے ملنا تھا اور پھر شام کے وقت اس کی واپسی تھی۔ اگر اسے بھوک نہ ستاتی تو شاید وہ ڈھابے پر نہ رکتا۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کی رونق دیکھتا رہا اور پھر بل ادا کر کے اٹھ گیا۔ وہ بڑے سکون سے ڈھابے کی تین چار سیڑھیاں اتر اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا جو کچھ فاصلے پر پارک کی ہوئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر بائی وے پر ٹریفک روال دواں تھی۔ تیز گاڑیوں کے گزرنے کی آواز اور بارن سے زندگی روال دواں معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا وہاں کے کسی ملازم نے اس کی کار کو صاف کر دیا تھا۔ جس پر اسے کافی اچھا محسوس ہوا۔

ابھی وہ کار کے قریب پہنچا ہی تھا اور جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولنا چاہ رہا تھا کہ اچانک دوسری طرف سے ایک مست الست سا جوگی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ جوگی اسے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ گوپال شاید اس کی طریف تو جہ نہ کرتا اور دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ جاتا۔ بھی اس جوگی نے حاکمانہ انداز میں کہا۔

”اے ابو بھوندو! ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چل۔  
ہمیں بھی جانا ہے۔“

اس کے یوں بدتمیزانہ انداز میں کہنے پر گویاں نے

گوپال شرما ہائی وے پر بے ڈھابے سے خوب سیر ہو کر کھانا کھا چکا تو پرسکون ہو گیا۔ تب اس نے اپنے ارد گرد دیکھا، ڈھابے پر اچھی خاصی رونق تھی۔ مختلف لوگ کھاپی رہے تھے۔ عورتیں بچے اور مرد اپنی اپنی دنیا میں مست تھے۔ موسم خاصا اچھا تھا۔ آسمان پر سفید بادل ریوٹی کے گالوں کی مانند تیر رہے تھے۔ سہ پہر ہونے لگی تھی۔ وہ غلت میں ممبئی سے نکلا تھا۔ صبح جب وہ آفس آیا تو اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے چانک پونا جانا پڑے گا۔ دوپہر کے وقت باس نے اسے اپنے آفس میں بلایا اور کچھ ضروری کاموں کے لیے پونا میں چند مختلف لوگوں سے ملنے کے بارے میں حکم صادر کر دیا۔ اس نے دفتر میں ہی اپنا ضروری سامان منگوا لیا اور کمپنی کی طرف سے دی گئی کار میں پونا کی طرف چل پڑا تھا۔ ممبئی سے نکلے تک وہ بہت مصروف رہا تھا یہاں تک کہ اسے کھانے کی بھی ضرورت نہیں ملی تھی۔ گوپال شرما بہترین شخصیت کا مالک، سنجیدہ اور وجہہ نوجوان تھا۔ وہ ایک معروف پرنٹنگ مشین میں منبجرتھا۔ وہ صرف اپنے کام سے کام لے کر رہتا تھا۔ اسی لیے وہ تیزی سے ترقی کرتا ہوا کمپنی کا منبجرتھا۔ یہاں اس پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ اسی لیے ضروری امور پنپنانے کے لیے باس نے گوپال کو مقرر کیا تھا۔ اب اُسے پونا پہنچنے کی جلدی نہیں

کو صاف ستھرا کر دیتے ہیں۔ گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ آج میں حقیقت میں اپنے آپ کو اتنا ہی ملکا چھلکا محسوس کر رہا تھا۔

تاکھاروم سے باہر آیا تو سب سے پہلے یہی خیال آیا کہ مجھے شکرانے کے نوافل ادا کرنے چاہیے۔ پھر خیال آیا کہ میں جائے نماز تو وہیں بھول آیا لیکن کمرے میں نگاہ دوڑائی تو ایک کارز میں جو دیوار پر شیلیف لگا تھا وہاں مجھے جائے نماز اور قرآن پاک رکھا ہوا دکھائی دے گیا۔ میں نے جائے نماز اٹھا کر شکرانے کے نوافل ادا کیے اور اثر کام پر اس شخص کو بلایا اس نے اپنا نام مجھے بتایا وہ مجھے ایک ہال میں لے کر پہنچا وہاں سب پہلے سے موجود تھے اور ایک بڑی ٹیبل کے گرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اندر پہنچ کر میں نے با آواز بلند سلام کیا۔ فوراً ہی ایک آواز میں جواب موصول ہوا۔ لیکن وہاں موجود ایک شخص کو بیٹھا دیکھ کر میں ٹھٹک گیا اور اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ مے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



نگاہ اس کمرے پر ڈالی یہ بھی خاصا کشادہ تھا۔ فرش پر  
نفیس قالین تھا کھڑکیوں پر بھاری پردے تھے۔  
وسیع پیڑ اور ساتھ میں دو کرسیاں اور درمیانی چھوٹی  
ٹبل تھی۔

میں نے قرآن پاک نیبل پر رکھا اور الماری کھول لی۔ یہاں کئی طرح کے لباس پیئنگر میں استری شدہ لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا وہ مختلف سائز کے تھے ایک سفید شلوار قمیص میرے سائز کا تھا وہ میں نے نکال لیا۔

میں نجانے کب سے صابن سے نہیں نہایا تھا۔ اس قید سلاسل میں اللہ پاک نے میرے دل کا تمام میل صاف کر دیا تھا جسم کا میل بھی اتر ہی جائے گا۔ میں ہاتھ میں کپڑے لیے واٹ روم کی جانب بڑھا۔ اندر واٹ بیسن کے سامنے آئینے میں اپنی صورت دیکھی پہلی ہی نگاہ میں میں اپنے آپ کو پہچان ہی نہیں سکا۔ یہ میں تو نہیں تھا۔ آئینے میں دکھائی دینے والے شخص کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ پیشانی پر نماز کا ہلکا سا نشان دکھائی رہا تھا۔ آنکھیں متورم اور ہونٹ خشک تھے۔ سر کے بال بھی خاصے بڑھ گئے تھے۔

میں نے اس وقت فیصلہ کیا کہ میں اپنے چہرے سے یہ داڑھی صاف نہیں کروں گا داڑھی تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آج سے اس نیت سے میں نے داڑھی رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے نیم گرم پانی سے شاور لیا کئی مرتبہ سر پر  
شیمپو کیا جسم پر صابن ملا تو احساس ہوا کہ جیسے میں  
اندر سے بہت ملا پھلکا ہو گیا ہوں۔

انسان جب اپنے برے اعمال سے توبہ کر لیتا ہے اور اپنے رب کی جانب پلٹ آتا ہے تو اللہ پاک اس کے گناہوں کو اس طرح دھو کر اس کے نامہ اعمال



اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے سر پر بڑا سا سیندوری رنگ کا پکڑا باندھا ہوا تھا۔ تن پر کچھ نہیں تھا۔ سیاہ بدن پر گھنے بال تھے۔ گلے میں مختلف رنگوں کی مالا تھی۔ جس میں چھوٹے بڑے منے تھے۔ اس نے سیندوری رنگ کی دھوتی باندھ رکھی تھی جس میں سے اس کی کالی کالی پنڈلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ پیروں میں کچھ نہیں تھا جس کے باعث اس کے پیرخت اور کٹے پھٹے تھے۔ اس کے چہرے پر نرم مٹھ نام کو نہیں تھی بلکہ ایسی عجیب ختی تھی جو خوف زدہ کر دینے والی تھی۔ بڑی بڑی بے ترتیب سیاہ موچیں اور اسی طرح الجھی ہوئی سیاہ داڑھی جن میں سے اس کے موٹے موٹے ہونٹ یوں دکھائی دے رہے تھے۔ جسے سوچے ہوئے ہوں۔ اس کی ظاہری وضع قطع اس لائق نہیں تھی کہ اسے اپنے ساتھ کار میں بٹھایا جائے اوپر سے بد تمیزانہ لہجہ ایسا تھا کہ گوپال کو بہت برا لگا۔ اس کے علاوہ جیسے ہی قریب سے ایک گاڑی گزری تو ہوا کے تیز جھونکے سے اس کی طرف سے ایسی غلیظ قسم کی کراہت آمیز بد بو آئی کہ گوپال کو لگا جیسے ابھی کھایا یا باہر آجائے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے وہ اپنے ساتھ نہیں لے کر جائے گا۔

”سوری مہاراج آپ کسی اور کے ساتھ چلے جائیں مجھے کچھ جلدی ہے۔“ اس نے جمل سے کہا تو اسی بد تمیزانہ لہجے میں بولا

”ابے کاہے کی جلدی..... ہمیں ساتھ لے چلو گے تو کیا ہے۔ راستے میں کہیں اتر جائیں گے۔“

مطلب اس کا کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا ایسے ہی ساتھ کار میں بیٹھنا تھا۔ یہ سوچتے ہی گوپال کے ذہن میں آیا کہ ابھی تو یہ سادھو اور جوگی دکھائی دے رہا ہے ممکن ہے کار میں بیٹھتے ہی پٹل نکال کر اسے نشانے پر رکھ لے۔ پھر وہ جوگی کار میں ہوگا اور یہ خود سڑک پر۔

اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایسی کئی وارداتوں کی خبریں گونج گئیں۔ سو اس نے اطمینان سے کہا۔

”میں نے کہا نا مہاراج میں آپ کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ آپ ایسا کرو کچھ روپے لے لو اور کسی بس میں بیٹھ کر چلے جاؤ۔“

”ابے بھوندو..... جب ہم نے کہہ دیا ہے کہ تیرے ساتھ جاؤں گا تو بس تیرے ساتھ جاؤں گا..... تو کار کا دروازہ کھول..... ہم اسی میں بیٹھ کر جاؤں گا۔“

”میں تو آپ کو لے کر نہیں جاؤں گا“ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

”وہ کیوں.....؟“

اس کے یوں پوچھنے پر گوپال کو غصہ آگیا عجیب آدمی ہے کہ میں اسے لے جانا نہیں چاہتا وہ زبردستی یوں پوچھ رہا ہے کہ کیوں جیسے وہ اسی کا ملازم ہے۔ تب اس نے جی میں کہا

”اس لیے کہ آپ جیسے روپ میں کئی لیرے بھی پھرتے ہیں۔ دیکھو آپ جو کوئی بھی ہو مجھے نہیں پتہ کہ آپ کون ہو۔ واقعی ہی کوئی جوگی ہو یا کوئی بہروپے۔ میں جب آپ کو روپے دے رہا ہوں کہ کسی گاڑی پر آجاؤ تو کیا قباحت ہے۔“

”اچھا تو تم نے ہمیں بہروپیا سمجھا۔“

”کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ بہروپیا ہے۔ اس فریبی اور مکار دنیا میں سچانے کون کون لوگ پھر رہے ہیں۔ سچانے کیسا بھیجیں بدلے ہوئے ہیں۔“

”فریب اور مکار دنیا.....“ جوگی بڑبڑایا

”تو اور کیا..... تیرے بدن سے اس قدر سڑاندھ رہی ہے کہ کوئی ٹھیک دماغ کا بندہ تیرے پاس کھڑا نہیں ہو سکتا اور تو کہتا ہے کہ میں تجھے کار میں لے جاؤں“

”نہ کیا تو نے ہمیں فریبی مکار اور بہروپیا سمجھا

ہے۔“ اس نے یوں پوچھا جیسے تفتیش کر رہا ہو۔

”دیکھو آپ جو کوئی بھی ہو مجھے معاف کر دیں آپ کو نہیں لے جا سکتا۔ آپ جائیں میں آپ کو روپے دے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے جیب میں سے کچھ روپے نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔ بھی اس جوگی نے روپے نظر انداز کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا

”مطلب تو نے ہمیں فریبی مکار اور بہروپیا سمجھا ہے۔“ وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے تصدیق کر رہا ہو۔

”یہ لو روپے..... اور جاؤ۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔“

اس نے یہ کہتے ہوئے روپے بڑھائے تو جوگی نے غصے میں وہ نوٹ پکڑے اور انہیں پھاڑ کر ریزہ ریزہ کر دیئے۔ پھر اس کی طرف یوں بھیا نک انداز میں دیکھا جیسے بہت غصے میں ہو اور اس کا بس نہ چل رہا ہو کہ اسے اس انکار پر کوئی سزا دے۔ پھر وہ بڑبڑاتا ہوا ایک طرف کو چل دیا لیکن اس کے جسم کی سڑاندھ اب بھی گوپال کو محسوس ہو رہی تھی جیسے اس کی طبیعت کو سخت ناگوار گذری ہو۔

اس نے اس جوگی کو ذہن سے نکالتے ہوئے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ کار ہائی وے پر ڈال لی۔ ذرا سا آگے جا کر اس نے کار نارمل رفتار سے بڑھادی۔ کچھ دیر تک وہ جوگی اس کے ذہن میں رہا۔ اسے جوگی پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ اگر اس نے جانا ہی ہے تو کم از کم بات تو تمیز سے کرے۔ ایسے جوگی اس لیے بھی سر پر چڑھ جاتے ہیں کہ بھارت میں انہیں خواہ مخواہ سر پر چڑھایا ہوا ہے۔ جو کامل اور دنیا داری سے فرار چاہتا ہے کوئی کام نہیں کرنا چاہتا وہ جوگی بن جاتا ہے یا کم از کم اس کا بہروپ ہی دھارنا کر لیتا ہے۔ تاکہ نہ صرف لوگ اسے سر پر اٹھائے رکھیں بلکہ ان کے کھانے پینے سے لے کر

نشے پانی تک کا بندوبست بھی لوگ ہی کریں اور یہ بھارت کے ضعیف الا اعتقاد لوگ انہیں اپنے سر پر بٹھاتے ہیں۔ ان سے سچانے کون کون سی باتیں مرادیں مانگتے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے باوجود کوشش کے وہ اس جوگی کو اپنے دماغ سے نہیں نکال سکا۔ ایسے ہی خواہ مخواہ کی بے چینی اس کے اندر در آئی تھی۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے دماغ سے نکال باہر کیا۔

وہ شیو پتا کے بارے میں سوچنے لگا جو زندگی سے بھر پور لڑکی تھی۔ وہ پونا میں اس کی اسٹنٹ تھی۔ ممبئی سے نکلتے ہوئے اس سے بڑی تفصیل سے بات ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاں ٹھہرنے کی آفر کی تھی مگر گوپال خود ہی طرح دے گیا تھا۔ وہ فوراً ہی تعلقات کو اس طرح پر نہیں لے کر جانا چاہتا تھا کہ جہاں پھر اسے مشکلات ہوں۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ شیو پتا اس میں دلچسپی لیتی ہے اور وہ بھی اسی کے جیسی ایک بھرپور لڑکی کو پسند کرتا تھا۔ وہ ہنستی بہت اچھا تھی۔ وہ شیو پتا کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک سامنے سے آنے والی کار سے بال بال بچا۔ ٹائروں کی تیز اور خوفناک چرچراہٹ سے وہ اپنے حواسوں میں آیا ہی تھا کہ اس کی جان نکل گئی وہ سڑک کی دوسری جانب تھا جدھر سے ٹریفک آ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کب اور کس وقت اپنی لین چھوڑ کر دوسری میں چلا گیا۔ کیا اسے نیند کا جھوٹا آیا تھا؟ وہ سو گیا تھا اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب سڑک کی دوسری جانب چلا گیا۔ اگر سامنے سے آنے والی کار اسے نہ بچائی تو اب تک وہ اس کا رام نام ستے ہو گیا ہوتا وہ دہل کر رہ گیا۔ اس نے فوراً ہی کار کو سڑک کنارے روکا اور اپنے اندر پھیلے ہوئے خوف پر قابو پانے لگا۔ ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ موت کا خوف اس وقت تک بندے پر حاوی نہیں ہوتا جب تک کہ اسے سامنے نہ دیکھ لے۔ بہت کم لوگ



کراچی  
نی راسا  
ملک کی روش

یہی پیکار ہوگی: معروضہ صفہ افزاء غیر اجماع کا خوبصورت سازبان ناقابل فراموش ناول

35620771/2 فون۔ رابطہ کریں۔

”نہیں مجھے کوئی خدمت نہیں چاہیے ہم جاؤ۔“ لڑکی نے یہ سنا تو کسی روبروٹ کی مانند باہر نکل گئی۔ گوپال نے جو تے اتارے اور پھیل کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ اسے کمرے کے اندر سے کندی لگانے کا بھی یاد نہ رہا۔ وہ جیونیا تو گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

پتیلیں رات کا وہ کون سا پہرہ تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس کے ارد گرد چراند پھیلی ہوئی تھی جیسے کوئی گوشت جل رہا ہو۔ اسے یوں لگا جیسے اسے الٹائی آجائے گی۔ اس نے گہرے گہرے سانس لیے تاکہ اس صورت حال میں الٹائی کو روکا جاسکے مگر وہ چراند لہجہ بہ لہجہ زیادہ ہوتی چلی گئی۔ اس کا دم ٹھنسنے لگا۔ اس نے باہر نکل کر دیکھنا چاہا مگر کارڈ روڈ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہاں کسی قسم کی کوئی بھی نہیں تھی۔ وہ کچھ دیکھ کر اپنی سانس بحال کرنا رہا، پھر واپس اپنے کمرے میں آیا تو وہ چراند نہیں تھی۔ اس نے سوچا ممکن ہے کچن میں کوئی گوشت جل رہا ہو اور اب اسے ہمالیا گیا ہو۔ اس نے وقت دیکھا ابھی رات کے آٹھ ہی بجے تھے۔ وہ کھانا نہیں کھانا چاہتا تھا لیکن اسے شدت سے کافی کی طلب ہوئی اس نے تیل دی لٹول بعد ایک نیم عریاں لڑکی کمرے میں آ گئی۔ وہ اسے یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی اپنی پسندیدہ غذا کو کھانے کے لیے جانتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

”کیا یہاں سب لڑکیاں ہی کام کرتی ہیں؟“ اس نے نووار لڑکی سے پوچھا۔

”میں مرد بھی ہیں۔“ اس نے اپنی عریانی کو مزید  
 واضح کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ عورتوں کے لیے ہیں۔“  
 ”اوہ!۔۔۔!“ وہ سمجھ گیا کہ ہائی وے پر یوں الگ  
 تھلک راستے پر گیٹ ہاؤس بنانے کا مطلب کیا  
 ہے۔ اسے فحش ہونے لگا کہ وہ یہاں کیوں ٹھہرا  
 ہے۔ آخر مجھے کیا میں نے کون سا یہاں برسوں رہنا  
 ہے۔ یہ پہلے جانا ہے۔ سو اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر

اندر نہایت پرسکون ماحول تھا۔ دھیمی دھیمی موسیقی کے ساتھ اسے لگا جیسے کسی پرانے مندر میں کوئی کندل میک رہا ہو۔ سامنے ہی استقبالیہ پر دو لڑکیاں موجود تھیں، جن کی آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی بڑی اور خوب صورت تھیں، تیکھی چتون اور سرخ لب وہ دونوں ہی اس کی طرف بہت گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنے بیک کے ساتھ استقبالیہ پر جا پہنچا تو اس میں سے ایک کھڑی ہو گئی اس نے نہایت مختصر لباس پہنا ہوا تھا۔ گوپال کو لگا جیسے یہ ابھی پہاں سے اٹھ گئی اور کسی استیج پر جا کر کوئی ہیجان خیز ڈانس کرنے لگے گی۔

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“ اس لڑکی نے یوں منمناتے ہوئے کہا جیسے اس کی آواز کہیں دور وادی سے آرہی ہے۔

”ایک کمرہ جو بہت پرسکون ہو، میں سونا چاہتا ہوں  
تاکہ صبح جلدی نکل سکوں۔“

”مل جائے گا۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ خود بھی  
 آ کر اس کے ساتھ پیش کر رہی ہے۔

”کتنی رقم دوں؟“ اس نے اپنا کارڈ اسے دیے

تھی۔ گوپال نے کمرہ لیا تو وہ لڑکی اسے خود کمرہ دکھانے

پورن ہی کے ایک کونے میں پرسکون سی جگہ پر اسے

نیم عریاں لڑکی اسی طرح کھڑی رہی۔ گوپال نے سوچا کہ لڑکی کو کھانسی سے روک دینا چاہیے۔

ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا

دیا۔ تب وہ ہمارا لود ہے میں برس۔  
 ”نہیں مجھے ٹپ نہیں چاہیے“ میں تو آپ کی خدمت

12 اگست 2013ء عید مبارک عید مبارک عید مبارک

ہوتے ہیں جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتے ہیں۔ گویا جس قدر چند لمحے پہلے گزرنے والے لمحوں پر غور کرتا گیا اسے اس قدر جھرجھری آتی گئی۔ وہ ایک دم ہی سے خوف زدہ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تک اسی طرح خود پر قابو پاتا رہا پھر پھر لمحہ اس کے حواس بحال ہوئے تو سوچنے پھنسنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی لیکن پھر بھی اس کے دماغ میں یہ سوال ضرور اٹک گیا کہ ایسا ہوا کیوں؟ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس کا جواب اسے مل گیا۔ چونکہ اس نے سیر ہو کر بے وقت کھانا کھا تھا۔ اس لیے نیند نے اس پر غلبہ پالیا۔ وہ نیند ہی میں شرک کے اس طرف چلا گیا اور کسی خوفناک حادثے سے بچ گیا۔ اس نے زندگی بچ جانے پر جھگوان (شکر) یہ ادا کیا اور چل پڑا۔ مگر اب اسے سفر کرنے میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ اگر پھر نیند کا جھونکا آ گیا تو.....؟ یہ سوال اسے بے چین کرنے لگا۔

وہ اسی بے چینی میں کار بڑھائے لیے جارہا تھا۔ اچانک بائیں ہاتھ پر اسے ایک گیسٹ ہاؤس دکھایا۔ سڑک پر اس کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔ اس کی لوکیشن بہت خوب صورت تھی۔ ہائی وے سے دائیں طرف کچھ دور ہٹ کر وہ گیسٹ ہاؤس خاصا رنگین دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن پر زور دیا جب وہ پہلے ادھر سے گذرا تھا تو یہ گیسٹ ہاؤس دکھائی دیا تھا۔ دو منزلہ عمارت کے باہر خاصی گاڑیاں کھینچیں۔ لوگ پھر رہے تھے۔ اس نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا کہ بجائے یونان جا کر کسی ہوٹل میں آرام کر کے کیوں نا ادھر ہی کوئی کمرہ لے لیا جائے۔ یہاں کسی خوفناک حادثے سے بہتر ہے۔ اس اچھے فیصلے کے بعد اس نے اپنی کار موڑی اور گیسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑا۔ چند لمحوں بعد اس نے کار پارک میں روکی اور اندر چلا گیا۔







وہ بھی اسے پکڑنے کو بے تابی سے آگے بڑھی۔ گوپال نے اسٹینڈ کو گھمبایا تو وہ اس کے سر پر جا لگا۔ ایک زردوار دھاکے کی آواز آئی اور وہ عورت ایک دم سے پھسل کر ڈھیر ہوتی چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک چھوٹا سا مٹی کا ڈھیر پڑا تھا۔ ایک دم سے گوپال میں نجانے کہاں سے قوت آگئی اس نے باہر کھڑے جانور سے بھی نپٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اسٹینڈ لے کر اس کی جانب بڑھا اور بھرپور قوت سے اس پر وار کیا۔ جیسے ہی وہ لوہے کا اسٹینڈ اس جانور کے لگا اسٹینڈ پھلتا چلا گیا جیسے وہ کاغذ کا بنا ہو۔ گوپال خالی ہاتھ ششدر کھڑا تھا۔ وہ پیچھے آگیا اور واپس اپنے کمرے کی جانب بھاگا۔ اس نے ایک دم سے سوچا تھا کہ وہ کھڑکی سے باہر چلا جائے گا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن اب وہاں پر وہ مخصوص چراند نہیں تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور کھڑکی کھولی۔ باہر سکون تھا۔ سنائے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے پہلے اپنا بیگ باہر پھینکا، کوئی بالکل نہ ہوئی پھر اس نے خود چھلانگ لگا دی۔ ابھی اس کے قدم زمین پر بھی نہیں لگے ہوں گے کہ ایک دم سے شور مچ گیا۔ وہی نیم برہنہ لڑکیاں ایک جانب سے اس پر حملہ آور ہو گئیں۔ اسے لگا کہ اب وہ بچ نہیں پائے گا لیکن اگلے ہی لمحے اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ ساری ایک دوسرے کے ساتھ لڑ رہی تھیں۔ جیسے ہی کوئی اس کی جانب ہاتھ بڑھاتی، دوسری اس کا راستہ روک لیتی، ایک دم سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ جیسے ہزار ہا جگنو وہاں پر آگے ہوں۔ وہ لاشعوری طور پر اپنے قدموں پیچھے کی جانب کھٹکنے لگا۔ شور ایسا تھا کہ کان بڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ غراتے ہوئے چیخ رہی تھیں۔ خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر اس پر بھی پڑ رہے تھے۔ لیکن وہ دھیرے دھیرے پیچھے کی جانب چلتا چلا جا رہا تھا کہ ایک دم مڑا اور بھاگنے لگا۔ مگر یہ

کوشش بھی رازیاں گئی سامنے وہی عجیب الحلقہ جانور کھڑا تھا۔ وہ بے بس ہو گیا۔ اسے لگا کہ اس کی موت آگئی ہے۔ پیچھے وہ عورتیں تھیں اور آگے یہ جانور وہ ان سے کس طرح بچ پائے گا؟ یہ سوچتے ہی اس نے گھما کر اپنا بیگ اس جانور کے منہ پر دے مارا جس سے یہ ہوا کہ وہ تھوڑا سا پیچھے کھسک گیا۔ گوپال کو کچھ حوصلہ ہوا کہ وہ مقابلہ کر سکتا ہے۔ وہ اپنا بیگ گھمانے لگا۔ مگر وہ وہیں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ عورتیں اس کے قریب آ گئی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ کسی ایک عورت کے ہاتھ آگیا تو باقی سب پر سکون ہو جائیں گی اور اسے چیر پھاڑ کر کھا جائے گی یا پھر اس کا لہو تو ضرور پئے گی۔ وہ پوری قوت سے اپنا بیگ گھمانے لگا۔ جس سے وہ جانور پیچھے کھٹکنے لگا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ عمارت سے نکل آیا تو وہ عورتیں بھی وہیں کھڑی ہو گئیں اور زور زور سے چیخنے لگیں۔ وہ جانور بھی پسپا ہو گیا اور پھر ایک دم سے وہ ایک طرف بھاگتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔ گوپال نے ایک دم سکون کا سانس لیا۔ ابھی اس کا سانس اندر ہی تھا کہ سامنے سے ہاتھی نما ایک جانور آگیا۔ وہ بالکل کینش دیوتا کا الٹ تھا۔ کینش دیوتا کا سر ہاتھی کا اور جسم انسان کا تھا، لیکن جو ہاتھی اس کے سامنے تھا اس کا بدن ہاتھی کا تھا اور اس کا سر انسان کا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ تیزی سے اس کی جانب آ رہا تھا۔ گوپال اس کے آگے لگ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ عمارت کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا ادھر چیختی ہوئی عورتیں اس کی منتظر تھیں وہ گیسٹ ہاؤس کے سامنے سے بھاگا اسے اپنی گاڑی دکھائی دے رہی تھی۔ جو تقریباً سو قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہ پوری قوت سے اپنی کار کی جانب بھاگا۔ ابھی اس کے سامنے ایک کتا آگیا جس کا رنگ سفید

تھا۔ وہ بھونکتا ہوا اس پر حملہ آور ہوا۔ وہ پہلے ہی محتاط تھا اس لیے لاشعوری طور پر ایک جانب کو بھٹکا دے گیا۔ وہ کتا اس کے اوپر سے گذر کر دوسری جانب جا گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ پھر اس پر چھلانگ لگانے کے لیے تیار تھا۔ گوپال کی توجہ بٹ گئی تھی۔ ایک طرف وہ ہاتھی تھا تو دوسری طرف خوفناک کتا جبکہ تیسری طرف وہ عجیب قسم کی عورتیں بری طرح چیخ رہی تھیں۔ اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ باقاعدہ بین کر رہی ہوں۔ وہ ایک حد میں تھیں اور آگے نہیں آ رہی تھیں۔

گوپال کے لیے سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا جس سے وہ ان کا مقابلہ کر سکتا۔ ایک بار ہی اس کے ہاتھ میں اسٹینڈ آیا تھا پھر وہ بھی نہیں رہا۔ اس نے تو یہ عجیب مخلوق دیکھی ہی پہلی بار تھی جسے دیکھ کر ویسے ہی خوف آ رہا تھا اس نے جواب تک کیا تھا وہ سب لاشعوری تھا اور اپنی لقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ وہ ان عورتوں کی طرف سے خود کو محفوظ سمجھنے لگا تھا لیکن ہاتھی اور کتے کی صورت میں جو افتاد اس کے سامنے تھے ان سے جان چھڑانے کے بارے میں اسے کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ جبکہ کتا پھر اس پر چھلانگ لگانے کو اپنا بدن لمبا کر چکا تھا۔ اس بار وہ شاید اس کے گلے کو پکڑ لے۔ جیسے ہی کتے نے اس پر چھلانگ لگائی دوسری طرف سے ہاتھی بھی چنگھاڑتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ گوپال نے خود کو نیچے گرا لیا۔ اگرچہ وہ خوفناک کتا اس کے اوپر سے گزر گیا، لیکن گوپال بے ہوش نہ رہا۔ اس کا سر جو سرک سے ٹکرایا تو اس کے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔ اس کے سامنے تارے ناچ رہے تھے اس دوران ہاتھی اس کے سر پر سوار ہو چکا تھا۔ صرف ایک یا دو ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت صرف کی اور ایک جانب لڑھکتا چلا

گیا۔ ایسے میں کتا اس کی طرف بھاگ کر آ رہا تھا۔ گوپال کے سر سے خون بہہ نکلا تھا۔ اس نے ہاتھ لگایا تو اس کا ہاتھ ہلوسے ٹھہر گیا۔ کتا قریب آ گیا تھا اس نے ششکارنے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کیا تو اس کے اپنے لہو کے قطرے اس کے پر جا پڑے۔ وہ قطرے اس پر کیا گرے کہ جیسے کسی نے اس پر آگ پھینک دی ہو۔ اسے آگ لگ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ خاکستر ہو گیا۔ گوپال حیرت سے مٹی ہوئے کتے کو دیکھ رہا تھا اس نے جلدی سے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور اپنے خون کو ہاتھی پر گرا دیا۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ گوپال کے ہاتھ میں تو جیسے ہتھیار آ گیا تھا۔ وہ ان چیختی ہوئی عورتوں کے پاس گیا اور اپنے خون کے چھٹے ان پر پھینک دیئے انہیں بھی آگ لگ گئی۔ کچھ دیر بعد ہر طرف سکون ہو گیا۔

اس نے گیسٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف دیکھا۔ اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہاں کی بتیاں گل ہو چکی تھیں۔ وہ انتہائی تھک چکا تھا اس لیے اپنے پیر گھسیٹتا ہوا اپنی کار کی جانب لپکا۔ وہ بہت شیشل سے کار تک پہنچ پایا۔ اس نے اپنی جیب میں سے کار کی چابیاں نکالی چابیاں مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی جیبیں خالی تھیں۔ اسے خیال آیا کہ چابی تو اس نے اپنے بیگ میں رکھی تھی۔ وہ واپس پلٹا اور اپنا بیگ تلاش کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ حد درجہ محتاط تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ کسی بھی طرف سے کوئی انجانا بلا وارد ہو سکتی ہے۔ کچھ دیر بعد اسے اپنا بیگ مل گیا۔ اس نے وہ بیگ جلدی سے اٹھایا اور واپس تیزی سے اپنی کار کے پاس آیا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور اس میں بیٹھ گیا۔ اس نے جابی انکیشن میں لگائی ہی تھی کہ اس کی کار کے ارد گرد آگ کا بالہ روشن ہو گیا۔ پہلے پہل وہ دائرے کی صورت میں تھا اور ایک ہلکی سی لکیر تھی مگر پھر



## شهینی ارشاد

اسلام ایک مکمل ضابطہ اخلاق اور دین فطرت ہے جس میں روزمرہ کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ ایسا کسی مذہب میں نہیں، خاص طور پر خواتین کی آزادی اور ان کے مسائل پر ہر مذہب خاموش ہے۔ عسائیت ہو یا یہودیت یا پھر ہندومت کوئی بھی مذہب کسی بیوہ کو دوسری شادی کا حق نہیں دیتا سوائے اسلام کے، وہ میاں اور بیوی کو ایک گاڑی کے دو پہیے قرار دیتا ہے یعنی دونوں کو برابر کے حقوق، ایک دوسرے کے لیے ناگزیر قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں فری میسن تحریک سے متاثرین جی اوز کی چند خواتین، خواتین کے حقوق کے نام پر اسلام کے خلاف بدتمیزی کی تمام حدیں پار کرتی نظر آئی ہیں۔

ایک حدیث کے پس منظر میں ایک نوجوان خاتون کی سچی کہانی وہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی  
دل کی آنکھ سے پڑھی جانے والی تحریر جو آپ کی سوچ اور ذہن کے تمام دروا  
کر رہی گی

گھر میں ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیوں کے گیت اور نصیحتیں اُنچے تھے کہ کان پڑتا ورنہ سنائی نہیں دے۔ تھی۔ لڑکیاں گانے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق میں بھی مصروف تھیں ساتھ ہی وہ اس ہنسی زبان و ریشا کے ساتھ بھی چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھیں۔ ایک سہیلی کوئی شوخ سا فقر و ریشا کی جانب اچھالتی تو ورنہ شرم سے اپنا چہرہ گھٹنوں میں

چھپاتی اور ساری سہیلیاں تہقہہ مار کر نرس پڑتیں۔  
 دریشا مایوں بیٹھی تھی کل اس کی مہندی اور پرسوں  
 بارات تھی۔ اس کی خالہ کے لڑکے ارسلان سے اس کی  
 شادی ہو رہی تھی ارسلان پیشے کے اعتبار سے انجینئر  
 تھے۔ امریکہ میں ملازمت کرتے تھے شادی کے سلسلے  
 میں آج کل پاکستان آئے ہوئے تھے جس طرح دریشا  
 حسن و خوب صورتی اور عادت اخلاق میں بہترین تھی

وہ ایم اے ایڈمیں شادی سے پہلے جاب کرتی تھیں  
 لیکن رحمن صاحب نے یہ کہہ کر جاب چھڑوا دی تھی کہ  
 میں کما تو رہا ہوں پھر تمہیں خوار ہونے کی کیا ضرورت  
 ہے آرام سے گھر میں بیٹھ کر بچے پالو یہ جملہ کہتے وقت  
 انہیں کیا معلوم تھا کہ نقدیر دردور کھڑی اس پر نرس رہی ہے  
 صرف چھ سال بعد یہی خوار سلطانیہ کا مقدر بن  
 گئی۔

ایسے ہی ارسلان بھی تھے سب ہی کا یہ کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ایک دوسرے ہی کے لیے بنایا ہے۔  
 وریشا سلطانہ نیکی کی اکلونی بیٹی تھی اولاد تو انہیں اللہ تعالیٰ نے تین عطا کی تھیں جن میں دو بیٹے اور ایک بیٹی

وہ وریشا کو گھر پر چھوڑ کر جاتی کیوں کہ حُسن صاحب گھر رہی ہوتے تھے وہ اس حد تک وریشا کی دیکھ بھال کر لیتے تھے کہ اس کو فیڈ رہنا کر دے دیتے یا پھر اگر زیادہ روتی تو اس کا جھولا ہلا دیتے وہ وزن نہیں اٹھا سکتے تھے

چشمِ زدن میں آگ بھڑکنے لگی۔ جو لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی چلی گئی۔ گو پالِ حدرد جگھبرا گیا۔ کیونکہ آگ نے اسے گھبرے میں لے لیا تھا اور وہ اس کی جانب بڑھ رہی

”کوئی پرابلم لگتا ہے۔ یہ بول نہیں پارے۔ ہم نہیں ایسویٹس میں لے جاتے ہیں، آپ ان کی کار لے کر پونا آجائیں۔“

جیسے ہی گوپال کے کانوں میں یہ آواز پڑی اس نے پورے زور سے شیویتا کو پکڑ لیا جیسے وہ اسے خود سے الگ نہیں کتنا چاہتا ہو۔

”او کے..... او کے..... میں ہی مہمیں پونا لیے چلتی ہوں۔“ اس نے کہا تو گویاں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہاں پر موجود لوگوں نے گویاں کو پچھلی نشست پر لے دیا تو شیوینا نے کارسٹارٹ کر کے بڑھادی تبھی گویاں نے محسوس کیا کہ جوگی کے بدن سے اٹھنے والے سڑاند جو کار میں پھیلی ہوئی تھی اب ختم ہوگئی ہے۔

اچانک اس کے ذہن پر جوگی کا چہرہ ہر آنے لگا۔ اس کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ بھی پھر وہ بولا۔

”کیوں بالک کیسی رہی اگر ہمیں کار میں بٹھالیتے تو یہ سب نہ ہوتا.....“ اس کے ساتھ ہی وہ چہرہ معدوم ہو گیا۔

”اب میں کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑاؤں گا..... بابا مجھے معاف کر دو.....“ گویا چنچ کر بولا تھا۔ شیوہ تانے حیرت

سے پلٹ کر دیکھا۔

”گوپال! کیا ہوا.....“ اس نے گاری سڑک سے کنارے روکتے ہوئے پوچھا۔ اس تمام عرصہ میں پہلی بار اس کے منہ سے کوئی آواز نکلنے لگی تھی۔

”کچھ نہیں..... تم گاڑی چلاؤ۔“ گوپال نے دھیر سے  
سے کہا اور آنکھیں موند لیں

چشمِ زدن میں آگ بھڑکنے لگی۔ جو لفظ بے لحاظ تیز ہوتی چلی گئی۔ گوپال حد درجہ گھبرا گیا۔ کیونکہ آگ نے اسے گھیرے میں لے لیا تھا اور وہ اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اب اس کے لیے نکل کر جانا بھی مشکل تھا۔ وہ چاہتا بھی تو کس طرف چاروں طرف آگ بلند ہو رہی تھی۔ ایک بار اس نے خوشی کی کہ وہ اس آگ کے ہالے سے کوہِ کر باہر نکل جائے مگر اس کا وجود ہی یوں ہو گیا تھا جیسے کسی نے ساکت کر دیا ہو۔ وہ ہمت ہار گیا اور اس نے موت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے اپنے آپ کو زندہ جل جانے کے سپرد کر دیا۔

کتنی ہی وقت گزر گیا۔ کوئی اسے جھوٹا سمجھتا تھا۔ اس نے آنکھ کھولی تو اسے لگا جیسے وہ بچ گیا ہے یا پھر وہ سو رگ میں ہے۔ اس کے سامنے شیوہیتا کا چہرہ تھا جو اس کے چہرے کو ہولے ہولے تھپک کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے شیوہیتا سے پوچھنا چاہا کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن کراہنے کے سوا وہ کچھ نہ کر سکا۔ ابھی اس کی نگاہ اپنی کار کے ارد گرد کھڑے لوگوں پر پڑی ان میں پولیس والے بھی تھے۔ تب اس کے حواس جاگے اور پورا زور لگا کر اس نے شیوہیتا سے پوچھا

”میں کہاں ہوں؟“

”گوپال ہوش کرو تم اپنی کار میں ہو اور کل شام سے ادھر ہو۔ کچھ لوگوں نے پولیس کو اطلاع دی تو انہوں نے کار نمبر پر تلاش کر کے باس سے رابطہ کیا۔ اس نے مجھے بتایا تو میں پوچھا کہ یہاں آئی ہوں۔ آپ کو کیا ہو گیا تھا،“ شیو تانے تفصیل بتا کر پوچھا تو گوپال کوئی جواب نہ دے۔ سکا اس نے ڈرتے ڈرتے بایاں جانب کی طرف دیکھ جہاں گیسٹ ہاؤس تھا۔ وہ یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہاں تو سوائے سرسبز و شاداب



اس لیے وریشا باپ کی ہانہوں کے جھولے کو ترستی رہی۔ سلطانہ بیگم اپنے ساتھ بڑے دونوں بیٹوں کو اسکول لے جاتی تھیں اور ساتھ ہی واپس لے آتی تھیں۔ وریشا تین سال کی ہوئی تو اسے بھی اسکول لے جانا شروع کر دیا۔ وہ سارا وقت اسکول میں آیا کے ساتھ رہتی تھی وریشا کو سنبھالنے کی تنخواہ سلطانہ بیگم اسے الگ سے دیتی تھیں۔

گھر واپس آ کر گھر سنبھالتیں وقت گزرتا رہا بچے بڑی کلاسوں میں آ گئے۔ ضروریات زندگی میں اضافہ ہوا بچوں کی تعلیم خوراک اور سب سے اہم رخصت صاحب کا علاج ضروری تھا سلطانہ آمدنی کو کیسے بڑھاتی پھر ایک ہی ذریعہ سمجھ میں آیا کہ شام کے وقت وہ بچوں کو گھر پر ٹیوشن بھی پڑھانا شروع کر دے سو اس نے ایسا ہی کیا۔ رفتہ رفتہ لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا سلطانہ نوے اور دسویں جماعت کے اسٹوڈنٹس کو پڑھاتی تھیں تعداد پچاس سے تجاوز کر گئی تو سلطانہ نے دو شفٹس کر دیں۔ ایک کلاس ختم ہوتی تو دوسرے اسٹوڈنٹ آ جاتے وہ رات کے تک مصروف رہتی۔

وقت کچھ اور آگے سرک گیا مگر سلطانہ کی روٹین یہی رہی البتہ اب بچے بڑھے ہو گئے تھے۔ رخصت صاحب مزید بستر سے لگ گئے وریشا باج کا سہ آ کر گھر کے کام کا سہمیت لیتی تھی اور سلطانہ کو کچھ بھی نہیں کرنے دیتی تھی۔ اس کا کام صرف درس و تدریس تک محدود ہو گیا تھا اب ٹیوشن والے اسٹوڈنٹس کی تعداد اور زیادہ ہو گئی تھی۔ سلطانہ صرف انگلش اور میتھ پڑھاتی تھی اب چار شفٹوں میں رات گیارہ بجے تک کلاسز ہوتی تھیں۔

وریشا نے جوان ہو کر خوب قد کاٹھ اور رنگ روپ نکالا تھا ایک دن جب رضوانہ خالہ سلطانہ سے ملنے کے لیے آئیں تو وہ وریشا کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ بکھرے بالوں اور تلکے کپڑوں میں گھر کے کاموں میں مصروف

وریشا حسن و خوب صورتی کا مجسمہ لگ رہی تھیں۔ اللہ نے انہیں تین بیٹوں سے نوازا تھا بڑا بیٹا ارسلان امریکہ میں جا کر رہتا تھا۔ ان دنوں وہ بڑی تندہی سے اس کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔

آج وریشا پر نگاہ پڑی تو انہیں لگا کہ ان کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔ انہوں نے گھر جا کر پہلے اپنے شوہر سے مشورہ کیا کہ وریشا اور ارسلان کی جوڑی کیسی رہے گی۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا خاندان کی دیکھی بھالی لڑکی تھی لیکن انہوں نے یہ ضرور کہا کہ آپ ارسلان سے بات کر لیں وہ امریکہ میں رہتا ہے ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے جیون ساتھی کے طور پر کسی اور کو پسند کر رکھا ہو یہ بات انہیں مناسب لگی اور جب انہوں نے ارسلان سے بات کی تو حیرت انگیز طور پر ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اس نے جواب دیا۔

”امی! جو بہتر بھتیجی ہیں وہی کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“  
”خوش رہو میرے بچے! کیا تم وریشا کو دیکھے بغیر اس سے شادی کے لیے تیار ہو؟“  
”میرا خیال ہے امی کہ وہ سلطانہ خالہ کی لڑکی ہے اور میں نے اسے دیکھا ہوا ہی ہے۔“ ارسلان نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اسے دیکھے ہوئے تمہیں پانچ سال تو ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم پاکستان آ کر ایک نظر اسے دیکھ لو پھر میں یا تاحدہ رشتے کی بات ڈال دوں گی۔ ویسے وریشا بہت اچھی لڑکی ہے اور مجھے بے حد پسند ہے۔“

”آپ کو پسند ہے تو بات ختم..... آپ رشتے کی بات کریں میں تیار ہوں۔“ ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور پھر رضوانہ خالہ اور سیمہ خالہ رشتہ لے آئے سلطانہ

بیگم کو بھلا کیوں انکار ہوتا لیکن انہوں نے بھی ڈرتے ڈرتے ہی کہا۔

”آپ آپ ارسلان کی مرضی معلوم کر لیتیں تو اچھا تھا۔“

”تم بے فکر ہو سلطانہ! میں نے ارسلان سے بات کر لی ہے اس کے بعد ہی میں تمہارے پاس آئی ہوں۔“ رضوانہ خالہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اور پھر ارسلان کی غیر موجودگی ہی میں رضوانہ خالہ نے وریشا کو ارسلان کے نام کی انگوٹھی پہنادی۔ ارسلان سے چھوٹا عمران تھا جو انتہائی نٹ کھٹ اور شوخ مزاج کا تھا اس نے وریشا کو چھیڑ چھیڑ کر ناک میں دم کر دیا۔

اب عمران اور وریشا کی اس نئے رشتے کے حوالہ سے خوب دقتی ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی ملتا اس کو ارسلان کا نام لے لے کر چھیڑتا رہتا وریشا بھی عمران کی اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتی۔

عمران کی کوہنی نہیں تھی وریشا سے بھابی کا رشتہ جڑا تو اسے ایک بہترین دوست اور بہن بھی مل گئی۔ موقع ملتے ہی وریشا بھی اسے چھیڑتی کہ اپنے لیے دیواری تو مجھے ہی تلاش کرنی پڑے گی دیکھنا تمہارے لیے کیسی دہن لے کر آئی ہوں۔

”بالکل اپنے جیسی لائے گا بھابی!“ وہ محبت بھرے لہجے میں کہتا۔

”ناممکن!“ وریشا ہنستے ہوئے کہتی۔ ”وریشا.....“

وریشا بے بھلا اس دنیا میں اس جیسی دوسری کہاں۔  
”اوہو! بڑی خوش فہمی ہے محترمہ کو! جائیے جائیے آپ اطمینان سے بیٹھیں اپنے لیے زندگی کا سا بھی مابذولت خود تلاش کر لیں گے۔“ اس نے کار بجاڑتے ہوئے کہا۔

”بالکل تلاش کر لینا! لیکن مجھ جیسی نہیں ملے گی۔“  
وریشا سے انگوٹھا دکھائی۔

”چاہیے بھی نہیں اس مصیبت کو بھگتنے کے لیے بچارے ہمارے ارسلان بھائی ہی کافی ہیں۔“ عمران اسے چھیڑتا تو وہ قریب رکھی ہوئی کوئی بھی چیز اس پر دے مارتی جسے وہ فوراً ہی بیچ کر لیتا اور وریشا غصے میں اس کے سلیٹے سے بے ہوش ہونے والوں کو ہاتھ مار کر رگڑ دیتی اور بھوت بھوت کہتی ہوئی وہاں سے بھاگ جاتی۔

سلطانہ بیگم جب ان لوگوں کی یہ پیار بھری جھڑپ دیکھتیں تو مطمئن انداز میں مسکراتیں انہیں یقین تھا کہ آپا بیگم کے گھر میں ان کی بیٹی کا مستقبل سنہرا ہے۔ اس گھر کا ہر فرد اسے بے حد پیار کرتا ہے۔ آپا بیگم آئے دن اس کے لیے کوئی نہ کوئی گفٹ لے آئیں، کبھی کپڑے بھی چوڑی بھی پرس۔

سلطانہ منع بھی کرتی کہ آپا بیگم ابھی یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے جب وریشا آپ کے گھر آ جائے گی تو جودل چاہے کیجیے گا! لیکن وہ محبت بھرے لہجے میں کہتیں۔

”ارے سلطانہ! تمہیں کیا پتا کہ جب میں بازار میں لڑکیوں کے استعمال کی اتنی خوب صورت چیزیں دیکھتی ہوں تو میرا دل کیسے چھلتا ہے کہ میری بھی کوئی بیٹی ہوتی جس کے لیے میں یہ سب کچھ خریدتی لیکن اب جب اللہ نے بہو کے روپ میں مجھے بیٹی دے دی ہے تو تم مجھے مت روکو۔“ اور سلطانہ بیگم ان کی محبت کے آگے ہار کے خاموش ہو جاتیں۔

ارسلان نے پاکستان آنے کی اطلاع دی تو جھٹ شادی کی تاریخ طے کر دی گئی اور دونوں جانب سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

وریشا کی اچھی شامت آئی تھی ادھر امی اسے بازار شاپنگ کے لیے لے جاتیں تو دوسری جانب خالہ بیگم آ جاتیں وہ بری کی ہر چیز وریشا کی پسند سے خرید رہی تھیں۔



اور پھر وہ مبارک دن بھی آ گیا جب ارسلان پاکستان آگئے اور نکاح کا دن آنپنچا۔ وریشا نے اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں اور سپردگی کے ساتھ نکاح نامے پر دستخط کئے کہ ارسلان کی محبت اس کی روئیں روئیں میں بس چلی تھی۔

اور پھر اچانک ایک رات جب سارا گھر مخمور خواب تھا،  
لاؤنج میں رکھا فون بڑی طرح جج اٹھا۔ فون کی گھنٹی پہلے  
بھی بجتی رہی تھی لیکن اس طرح ابھی کسی کا دل نہیں دہلا  
تھا، سب ہی اٹھ کر فون کی جانب دوڑ پڑے، عمران فون  
کی جانب بڑھا تو خالہ بیگم نے جھٹ دل پر ہاتھ رکھا  
لیا۔

”لیکن رات کے دو بجے۔“ خالہ بیگم نے فکر مند لہجے میں کہا اتنے میں عمران نے فون اٹھا لیا۔ اس وقت فون سیٹ پر سی ایل آئی نہیں ہوتا تھا اس لیے فوراً معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کس نمبر سے کال آئی ہے۔

”ہیلو.....“ عمران نے فون اٹھا کر کہا۔

اور پھر وہ خاموشی سے دوسری جانب سننے لگا اور اس کے ہاتھ سے فون گر گیا اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

”کیا ہوا..... کس کا فون تھا؟“ پاپا نے آگے بڑھ کر تار کے ساتھ لٹکتا ہوا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ لیکن دوسری جانب سے کال منقطع ہو چکی تھی۔ انہوں نے ریسیور سیٹ پر رکھا اور عمر ان کی جانب بڑھے جو سکتے کے عالم میں ایک جانب گھورے جا رہا تھا اس کے جسم پر لرزا سا طاری تھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔

”ارے عمران! کس کافون تھا..... کیا ہوا ہے..... تم  
 ول کیوں نہیں رہے ہو؟“ انہوں نے عمران کو جھنجھوڑ ڈالا  
 یک چیخ مار کر پاپا سے لپٹ گیا اور اس کے منہ سے پہ  
 شکل نکلا۔

”پاپا! ارسلان بھائی، ہمیں چھوڑ کر چلے گئے، ان کا  
یکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“



— 16 —



ان دونوں کے بغیر مکمل ہے۔“

”کہیں نہیں جا رہی ہیں بھابی اس گھر سے انہیں جانے کون دے گا اور پھر وہ خود بھی تو نہیں جانا چاہتیں تو پھر کوئی ان کے ساتھ زبردستی کیسے کر سکتا ہے آپ نے خواہواہ اتنی ٹینشن لی آپ فکر نہ کریں جیسا آپ چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔ اب آپ جائیں اور اطمینان سے سو جائیں۔“ عمران نے انہیں تسلی دیتے ہوئے اچھی طرح سے سمجھایا۔

”لیکن عمران وہ جوان بچی ہے ابھی اس کی شادی وہ دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ اللہ نے اسے بیوگی عطا کر دی اور بیٹا! یہاں اس گھر میں دو جوان دیور ہیں اس کی شادی ہونی چاہیے اس کا گھر دوبارہ بسنا چاہیے زندگی کی خوشیوں پر اس کا حق بھی اتنا ہے جتنا کسی دوسری کنواری لڑکی کا۔“ خالہ بیگم نے الجھن آمیز لہجے میں جھنجھلا کر کہا۔

”آپ بھابی کی دوسری شادی کے حق میں ہیں اور یہ بھی نہیں چاہتیں کہ وہ اس گھر سے جائیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کس طرح ممکن ہوگا۔ ان کی شادی ہوگی تو انہیں اس گھر سے جانا تو ہوگا ناں می!“ اس مرتبہ عمران کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

”ایسا ممکن ہے بیٹا! اگر تم چاہو.....“ خالہ بیگم نے معنی خیز لہجے میں کہا اور آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”میں کیوں نہیں چاہوں گا امی! بلکہ میرا خیال بھی یہی ہے کہ بھابی کی اب دوسری شادی ہو جانی چاہیے۔ ارسلان بھابی کی پہلی بری بھی گزر چکی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”تم میری بات سمجھ نہیں رہے ہو عمران! میرا مطلب ہے کہ.....“ اتنا کہہ کر وہ پھر کمر گئیں۔

”ہاں بولیں می! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“ عمران نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

”میرا مطلب ہے بلکہ میری اور تمہارے پاپا کی خواہش ہے کہ ہم تمہاری اور وریشا کی شادی کر دیں۔ اس طرح وریشا اور عریشہ کو کہیں اور جانا بھی نہیں پڑے گا اس گھر میں رہیں گی ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر۔“ خالہ بیگم نے ایک ہی سانس میں ساری بات بیان کر دی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں می آپ.....“ عمران کو جیسے یسن کر ہزار وولٹ کا کرنٹ لگ گیا۔ ”ایسا کیسے ممکن ہے مم..... میں..... اور وریشا بھابی..... نہیں..... بھی نہیں..... امی میں انہیں بھابی بنا کر کتنے ارمان سے اس گھر میں لایا تھا میں انہیں بیوی کا رتبہ کس طرح سے دے سکتا ہوں۔“

”وہ تمہاری بھابی اس وقت تک تھی جب ارسلان زندہ تھا لیکن ارسلان کے بعد یہ رشتہ خود بخود ختم ہو گیا اب وریشا آزاد ہے کسی کے ساتھ بھی نکاح کرنے کے لیے۔“ خالہ بیگم نے تیزی سے کہا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی! لیکن بعض رشتہ دلوں میں اس طرح سے بن جاتے ہیں جو ٹوٹنے کے باوجود نہیں ٹوٹتے وریشا کل بھی میری بھابی تھیں اور ہمیشہ رہیں گی۔“ عمران نے متحی لہجے میں کہا۔

”پھر وریشا کو اس گھر سے جانا ہوگا۔“ انہوں نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر دھواں دھار طریقے سے رونے لگیں۔

”اگر وریشا بھابی کی مرضی نہیں ہوگی تو کوئی ان کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا اور میرا خیال ہے کہ وہ بیٹھیں رہیں گی۔“ عمران نے ایک بار پھر انہیں تسلی دی۔

”کب تک بیٹا آخر کب تک..... کل کو تمہاری شادی ہوگی اور اگر تمہاری بیوی کو وریشا اور عریشہ کا وجود ناگوار گزرا تو..... میری بچی کی زندگی تو برباد ہو جائے گی۔“ ان کا رونا پھر شروع ہو گیا۔

”چاہے کسی کو اچھا لگے چاہے برا..... میں اپنا وہ وعدہ تاحیات نبھائوں گا جو آخری ملاقات میں میں نے ارسلان بھابی سے کیا تھا بھابی کا خیال رکھنے کا۔ آپ کو کبھی مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔“ عمران نے قطعیت بھرے لہجے میں کہا۔

”ابھی تم ایسا کہہ رہے ہو لیکن کل جب آنے والی آجائے گی اور اسے وریشا اور عریشہ کا وجود ناگوار گزرا تو تم اپنا گھر بچانے کے لیے اور اس کی خوشی کے لیے سب کچھ کر گزرو گے۔“ انہوں نے ناراضگی سے کہا۔

”افوہ می! ابھی وہ اس گھر میں آئی نہیں اور ابھی سے آپ نے اس کی جانب سے بدگمانی پال لی۔ میں جب کہہ رہا ہوں کہ میں اپنے مرحوم بھائی سے کیے وعدے سے کبھی نہیں پھروں گا تو پھر آپ کو کیوں نہیں یقین آ رہا۔ اچھا بتائیے ارسلان بھابی کے بعد اس ایک سال میں آپ نے کبھی دیکھا کہ میں نے اپنے فرائض سے کوتاہی برتی ہے میں ہر طرح بھابی اور عریشہ کا خیال رکھتا ہوں۔“ عمران مسلسل خالہ بیگم کو قائل کرنے اور سمجھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

”میں ابھی کی بات نہیں کر رہی میں تو تمہاری شادی کے بعد کی بات کر رہی ہوں۔“ خالہ بیگم نے کہا۔

”اگر میری شادی کو لے کر آپ کے دل میں اتنے ہی اندیشے تو میں شادی ہی نہیں کروں گا۔ اپنی ساری زندگی اپنی بھابی اور بیٹی کے لیے وقف کر دوں گا اب تو تم یہ کیا پ؟“ عمران اس مرتبہ تھوڑا سا جھنجھلا گیا۔

”زندگی صرف کھا لینا اور پین لینا ہی تھوڑی ہے زندگی گزارنے کے لیے ایک محبت کرنے والے مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اگر تم شادی نہیں کرو گے تو مجھ سے لیے دو دکھ ہو جائیں گے ایک تمہارا اور ایک وریشا کا اور اس چاقی چاتی ہوں کہ.....“

”کئی بس.....“ عمران نے فوراً خالہ بیگم کی بات

کاٹ دی اور ہاتھ اٹھا کر انہیں آگے بولنے سے روک دیا۔

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بھابی..... بھابی کی رٹ لگا رکھی ہے اگر وہ نہیں رہی تیری بھابی! تیرا بھائی بیوہ کر گیا ہے اسے۔ میرا فیصلہ کم تان کھول کر سن لو میں نے تمہارا اور وریشا کا نکاح کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ خالہ بیگم نے سخت نگاہوں سے عمران کو دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا اور اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے کمرے سے جانے کے بعد عمران ساری رات اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹھٹھکتا رہا۔

اور پھر سلطانہ بیگم خالہ بیگم دوسرے کمز ہر کوئی وریشا اور عمران کو اس رشتے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن دونوں اپنی جگہ سختی سے انکاری رہے۔

پھر ایک دن سلطانہ بیگم آن بچی اپنی بیٹی اور نواسی کو لے جانے کے لیے۔ وریشا اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگی۔ آج اس گھر کے درو دیوار پر ایک بار پھر ادا سی ہال کھولے بین کر رہی تھی۔ خالہ بیگم اپنے کمرے میں بند تھیں وریشا جب انہیں اللہ حافظ کہنے ان کے کمرے میں گئی تو وہ بیڈ پر بے ہوش پڑی تھیں۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ معمولی سا سہارٹ اٹیک تھا ایسا شدید صدمے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آئندہ احتیاط نہ کی گئی تو زیادہ نقصان بھی ہو سکتا ہے۔

عمران اور وریشا سمجھ گئے کمی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے اور پھر دونوں نے ہتھیار ڈال دیئے یہ خوش خبری سن کر خالہ بیگم تیزی سے صحت یاب ہوئے لیکن اور پھر چند ضروری رشتہ داروں اور احباب کی موجودگی میں وریشا اور عمران کا نکاح ہو گیا۔ اس روز سب ہی کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے سوائے وریشا اور عمران کے دونوں کے چہروں پر انتہائی گہری سنجیدگی ہوید تھی۔

رات کو زیادہ تر مہمان رخصت ہو گئے سلطانہ بیگم



جانب بڑھ گئے۔

اسے رہ کر وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جب اس نے ارسلان کی بھراہی میں اس گھر میں قدم رکھا تھا جب وہ پھولوں سے لدی تیج پر دلہن بنی ارسلان کا انتظار کر رہی تھی تب اس کے دل میں کتنے ارمان تھے کتنی خوشی اور امنگ تھی لیکن آج..... آج ایک بار پھر ارسلان سے جدائی کا زخم تازہ ہو گیا، وہ بلکنے لگی اور تصور میں ارسلان کو مخاطب کر کے بولی۔

اس کی سسکیاں بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھیں تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو وہ چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔

دریشا کی آنکھیں رو رو کر سرخ اور متورم ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے بھاری اور جھبی آواز میں علیکم آسلام کہا تو عمران چلتے ہوئے بیٹھ کر قدرے فاصلے پر رکھے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔ کمرے

”مجھے معلوم ہے ویرثہ کا آج آپ بھی خوش نہیں ہیں نہ میں اس رشتے میں بندھنا چاہتا تھا اور نہ آپ..... لیکن ہم مجبور کر دیئے گئے، مجھے آج بھی الفاظ یاد ہیں جو ارسلان بھائی نے رخصت ہوتے وقت مجھ سے کہے تھے اور میں ان سے کیے گئے اپنے وعدے کو بھی نہیں بھولا ہوں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں، ہم جیسی زندگی پہلے گزار رہے تھے اب بھی ایسے ہی گزاریں گے۔ گھر والوں کو اور دنیا والوں کو مطمئن کرنے کے لیے ہم اس رشتے میں بندھ گئے ہیں لیکن اس سے ہمیں کوئی فرق

میں کہا اور بیڈ سے اتر کر ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے اور ہاتھ منہ دھو کر باہر آئی تو عمران صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے اور بازو آنکھوں پر رکھے بیٹا تھا اس نے ٹیوب لائٹ آف کر کے نائٹ بلب آن کر دیا اور بیڈ پر آ کر نیم دراز ہو گئی۔

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

خالہ بیگم جہانگیرہ خاتون تھیں وہ وریشا اور عمران کے چہروں پر اس خوش کوٹھنتیس جو ایک نو بہتا جوڑے کی شکلوں پر شادی کے ابتدائی دنوں میں دکھائی دیتی ہے، انہیں اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب ارسلان سے وریشا کی شادی ہوئی تھی تو یہی وریشا تھی جو بات بات پر ہلکھلا جاتی، چڑیا کی طرح جھپکتی لیکن اب تو بھولی بھٹکی بے جان مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایسا ہی کچھ حال عمران کا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح وہ وریشا اور عمران سے پوچھیں کہ انہوں نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کی حیثیت سے قبول بھی کیا ہے یا نہیں۔

وہ دن رات کڑھتی رہتیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں شوگر ہوگئی اور ایک دن ہارٹ ایک ہو گیا وہ ابھی اسپتال سے گھر بھی نہیں آئی تھیں کہ انہیں دوسرا ٹیک ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ ان کے انتقال پر ورثہ تراپ تراپ کر روئی انہوں نے اسے بے انتہا پیار دیا تھا اور اس کی خوشی کے لیے اپنے بیٹے کی خوشیوں تک کو قربان کر دیا تھا۔



وقت اسی طرح گزرتا رہا اور ریشا نے مکمل طور پر قرآن میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ عمران بھی دینی کتب کے مطالعے میں مصروف رہتا۔ اس روز وہ ہمیشہ سے زیادہ اداس تھی وہ بیس اپریل کا دن تھا۔ ارسلان کی دوسری برسی تھی عمران نے مسجد میں قرآن خوانی کروائی اور ایدھی سینٹر کھانے کی دیکلین اور کپڑے بچھوائے۔

اس رات جب وریشا قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی تو وہ ایک دم چونک پڑی اس نے قرآن بند کر کے رکھ دیا اور سوچنے لگی۔

وہ کس حیثیت سے آج ارسلان کو یاد کر رہی ہے اس کی یاد میں آنسو بہا رہی ہے وہ تو عمران کی منکوحہ ہے اس کی بیوی ہے۔ وہ کسی بیوی ہے کہ جس نے آج تک اپنے شوہر کو حق زوجیت ہی نہیں دیا کیا اللہ تعالیٰ اس کی جانب پسندیدگی سے دیکھے گا کیا اس کی نمازیں قبول کرے گا؟ اس کے ساتھ ہی اسے بہت پہلے پڑھی ہوئی ایک حدیث یاد آگئی وہ تیر کی مانند تھی اور بگ شیف کی جانب بڑھی اس نے حدیث کی ایک کتاب اٹھائی اور اس میں سے ”شوہر کے حقوق“ سے مطابق احادیث کو پڑھنا شروع کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو سجدہ کرے اگر اس کی اجازت ہو تو بیوی کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ شوہر کا اپنی بیوی پر عظیم حق ہے اتنا عظیم حق کہ اگر شوہر کا سارا جسم زخمی ہو اور بیوی شوہر کے زخمی جسم کو زبان سے چالے تب بھی شوہر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔“ (مسند احمد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک بیوی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”مومن کے لیے خوف خدا کے بعد سب سے زیادہ مفید اور باعث خیر نعمت نیک بیوی ہے کہ جب وہ اس سے کسی کام کو کہے تو وہ خوش دلی سے

انجام دے اور جب وہ اس پر نگاہ ڈالے تو وہ اس کو خوش کر دے اور جب وہ اس کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے اور جب وہ کہیں چلا جائے تو وہ اس کے پیچھے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کے مال و اسباب کی نگرانی میں شوہر کی خیر خواہ اور وفادار رہے۔“ (ابن ماجہ)

وہ دیر تک احادیث کا مطالعہ کرتی رہی پھر اپنے عمل پر غور کیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر رہے۔ عمران نے اس کا کتنا خیال رکھا ہے لیکن اس نے آج تک بھی عمران کی جانب ایک بیوی والی محبت کی نگاہ نہیں ڈالی وہ کتنا تھکا ہوا گھرا تا ہے آتے ہی عریضہ اس کی گود میں چڑھ جاتی ہے۔ وہ اسے گود میں اٹھائے اٹھائے گھمانے پھرانے لے جاتا ہے اپنے کندھے سے لگا کر سلاتا ہے لیکن اس نے کبھی اس کے تھکے ہوئے جسم کو آرام پہنچانے کی کوشش نہیں کی کیا اس کا اتنا ہی فرض ہے کہ کھانا پکا کر اس کے آگے رکھ دے اور بھی بہت سی باتیں تھیں جنہیں وہ یاد کر کے شرمندہ ہوتی رہی اور شرمندگی کا یہ شدید احساس اسے ان احادیث کو پڑھ کر ہوا تھا اس نے ایک بار پھر ساری احادیث کو بغور پڑھا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وضو کر کے دو رکعت صلوٰۃ التوبہ ادا کی اور اللہ سے عہد کیا کہ وہ ایک مومن بیوی کا کردار ادا کرے گی اسے یاد آیا سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ”تم ایک دوسرے کا لباس ہو“ یکا یک اس کے دل میں عمران کے لیے نئے انداز میں محبت اجاگر ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد عمران عریضہ کو لے کر کمرے میں آئے اور اسے آرام سے بیڈ پر لیٹا دیا تب وریشا نے کہا۔

”آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔“ وریشا کے اس جملے پر عمران نے چونک کر اسے دیکھا۔ شادی

کے بعد ان چھ مہینوں میں آج پہلی مرتبہ وریشا نے ایک نئے انداز میں نئے لب و لہجے سے اسے مخاطب کیا تھا وہ چند لمحے کھڑے اسے دیکھتے رہے پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔

”ہاں آج آفس میں بھی کام زیادہ تھا پھر عریضہ بھی ضد کر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے سلا یا ہے۔ آپ ٹھیک ہیں ابھی تک سوئی نہیں؟“

”جی ٹھیک ہوں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ عریضہ آپ کو بہت تنگ کرتی ہے تھکا دیتی ہے۔“ وریشا نے محبت بھری لہجے میں کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے بس کبھی کبھی رات کو نیند نہیں آتی اور صبح کام بھی زیادہ ہوتا تھا کاٹ ہو جاتی ہے۔“ عمران نے کہا اور کپڑے تبدیل کرنے چلے گئے۔ وہ آئے تو وریشا اس صوفے پر بیٹھی تھی جس پر عمران سویا کرتے تھے وہ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر چونک گئے اور بولے۔

”آپ کو کوئی کام ہے مجھ سے؟“

”آج سے آپ بیڈ پر آرام سے سوئیں میں یہاں سوجایا کر دوں گی۔“

”جنہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں یہاں کنٹریشنل ہوتا ہوں۔“ عمران نے کہا تو وریشا نے بے تکلفی سے اس کا بازو تھاما اور بیڈ پر لے آئی اور سینے پر دونوں ہاتھ کر کے ہیکلے سے دھکا دیتے ہوئے بولی۔

”آپ لیٹیں میں آپ کا سر دبا دیتی ہوں ابھی نیند آجائے گی۔“ عمران پر وریشا کے اس رویے سے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے وہ بوکھلا کر بولا۔

”نہیں بھئی اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ لیکن وریشا اس کے سر ہانے بیٹھ چکی تھی وہ اپنے ملائم ہاتھوں سے اس کا سر دبا دیتی رہی اور ذرا دیر بعد عمران کی سانسیں بھاری ہونے لگیں اور وہ سو گئے تو وہ چپ چاپ صوفے پر آ کر

لیٹ گئی۔

اس کے اندر کی حیا سے اس سے زیادہ آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی البتہ اب اتنا ضرور ہو گیا تھا کہ وہ دیر تک بیٹھ کر ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے۔ کبھی دونوں ایک دوسرے کی دن بھر کی مصروفیات پر بات کرتے کبھی عریضہ کی بھٹی منی شراوتوں پر..... اب وہ لفظوں کو توڑ توڑ کر بولنا سیکھ گئی تھی۔ کبھی اپنے حاصل مطالعہ جو وہ قرآن اور دینی کتب سے حاصل کرتے اس پر گفتگو کرتے۔

آہستہ آہستہ انہوں نے ایک دوسرے کا ساتھ قبول کر لیا تھا اپنی باتیں اپنے مسائل شیئر کرنے لگتے لیکن ایک دیر پر وہ اب بھی دونوں کے درمیان حائل تھا۔ ایک دن وریشا نے عمران کو احادیث کی وہی کتاب دیتے ہوئے کہا۔

”عمران میں نے احادیث مبارکہ کی یہ کتاب پڑھی ہے اور اس سے اپنے عمل کے لیے بہت کچھ سیکھا بھی ہے اور عمل بھی کیا ہے آپ بھی اس کو ضرور پڑھیے آپ کو بھی فائدہ ہوگا لیکن اس سے پہلے مجھے امی کے گھر چھوڑ آئیں ان کا فون آیا تھا کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ کل مجھے لینے آجائیے گا۔“ عمران نے وریشا کے ہاتھ سے کتاب لے لی اور اسے بیڈ کے ساتھ ٹیبل پر رکھ دیا اور وریشا کو لے کر خالہ جانی کے گھر آ گئے۔

واپس آ کر وہ بیڈ پر لیٹے تو کمرہ بہت سونا سونا لگنے لگا آج پہلی مرتبہ انہیں وریشا کی غیر موجودگی کھل رہی تھی۔ انہوں نے اپنے دل کو ٹوٹا اور وریشا جو کبھی بھابی تھی کہیں جاسوئی تھی آج جس کی یاد آ رہی تھی اس کمرے میں کی محسوس ہو رہی تھی وہ دوسری وریشا تھی۔

نہیں نہیں مجھے ان کے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے اگر انہیں میرے دل میں پیدا ہونے والے اس جذبے کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ کیا سوچیں گی۔ وہ



# قلندر

امجد جاوید

قلندر تو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندہ ریچہ اور کچے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آپن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخیر کرنے کی دھن میں افسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

پرس رہی تھی۔ میں خاموش رہا تو کہتی چلی گئی۔

”تمہیں صرف یہی اعتراض ہے کہ اماں میرے پاس کیوں ہے، کتنا تحفظ دے سکے گی مجھے یہی نا یا شاید میں تمہارے دشمنوں سے مل کر اماں کو ضمانت کے طور پر رکھے ہوئے ہوں۔ اگر تو ایسا سوچ رہا ہے تو پھر ایسا کر مجھے لے چل اپنے پاس مجھے رکھ لے ضمانت کے طور پر اپنے پاس اگر تمہیں بھی کوئی گستاخی کروں تمہیں شک بھی ہو جائے کہ میں تجھے نقصان پہنچاؤں گی تو بے شک مجھے مار دینا، تم سے پھر حساب لینے والا بھی کوئی نہیں ہوگا، بولو تم کیا فیصلہ کرتے ہو اماں کو یہاں رہنے دیتے ہو یا مجھے اپنے ساتھ لے جاتے ہو بولو.....؟“

”میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا سوہنی، میں تجھے کیوں رکھوں میرا تم سے کیا لینا دینا۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”ایسے نہ کہو جمال.....! میں نے تجھے اپنا سب کچھ مان لیا ہے میں ڈرتی ہوں اس وقت سے کہ تمہیں کوئی نقصان نہ ہو جائے۔“ اس نے بھی دھیمے لہجے میں کہا تب میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے باتوں کے جال میں

سوہنی کو دینے کے لیے میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اخلاقی طور پر مجھے، اس طوائف کو لازماً سہارا دینا چاہیے تھا جو ایک بہتر زندگی کی طرف آنا چاہتی تھی۔ مگر کیا یہ حقیقت تھی یا فریب میں اسی پر سوچ رہا تھا کہ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

”تم ابھی اور اسی وقت اماں کو لے جاسکتے ہو میں تمہیں بالکل نہیں روکوں گی۔“

”تم صرف اور صرف مجھے جذباتی طور پر بلک میل کرنے کی کوشش کر رہی ہو طوائف رہنا یا اچھی اور عزت والی زندگی گزارنا تمہارا اپنا فیصلہ ہے تم چاہو تو اپنی زندگی خود بنا سکتی ہو۔“ میں نے ایک کمزوری دلیل کا سہارا لیا۔ جس کے پھسپھے ہونے کا مجھے خود احساس تھا۔

”تو پھر جاؤ لے جاؤ میں اپنی زندگی جیسے چاہوں گزاروں ملک سجاد بیچ گیا تو اس کی مرضی کے مطابق اس کے اشاروں پر ناپنا ہوگا وہ نہ رہا توئی دوسرے نکلا۔ میں چاہوں بھی تو اس کرپٹ معاشرے میں با عزت زندگی نہیں گزار سکتی۔ کون دے گا تحفظ تم جیسا کوئی.....؟“ اس بار اس کے لہجے سے آگ

آگے اور بھی بہت سی احادیث تھیں جن میں شوہر اور بیوی کے ایک دوسرے کے حقوق کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کچھ ارشاد فرمایا تھا۔ کتاب ختم کر کے انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے وریشا کو آج تک ایک بیوی ہونے کا حق تو دیا ہی نہیں ہے کیا اللہ ان سے راضی ہوگا؟

وہ سوچتے رہے اور پھر سو گئے دوسرے دن وہ آفس نہیں گئے۔ انہیں کچھ ضروری تیاریاں کرنی تھیں وہ کر کے وہ بازار گئے۔ وریشا کے لیے ایک بیوی کو دینے کے لیے تحفہ خریدا اور خالہ جانی کے گھر جا پہنچے آج وہ بہت خوش تھے یہ بشارت ان کے چہرے سے ظاہر تھی انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے اپنے اوپر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتار چھینا ہو۔ انہوں نے آ کر پہلے خالہ جانی کی خیریت پوچھی وہ اب بالکل ٹھیک تھیں پھر اپنے سابقہ شوخ لہجے میں کہا۔

”خالہ جانی! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنی دلہن کو لے جاؤں میرا گھر بہت اداس ہے۔“ اور وریشا عمران کے چہرے اور آنکھوں کی شوخی کو دیکھتے ہوئے حیا آلود چہرے کے ساتھ عیاں پہنے گی۔ آج وہ بہت خوش تھی کیوں کہ وہ اپنے شوہر کے گھر جا رہی تھی۔

اللہ کا یہ احسان تھا کہ اس نے وریشا اور عمران کو ایمان اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عطا کی تھی کہ آج جن کے پیارے پیارے احکامات کی روشنی میں انہوں نے بھی اپنی زندگیوں میں چراغ افشا کر لیا تھا ایک کٹھن رات بھی جو گزر گئی۔

ارسلان بھائی کی امانت ہیں اور کچھ نہیں۔ انہوں نے اپنے دل کے اندر اٹھنے والی آواز کو سختی کے ساتھ دبا دیا۔ بے قراری سے کروٹ لی تو کتاب پر نگاہ پڑی انہوں نے سوچا کہ احادیث کا مطالعہ کروں گا تو اپنے خیال سے توجہ ہٹ جائے گی۔ یہ سوچ کر انہوں نے کتاب کھولی تو ایک صفحہ مڑا ہوا تھا اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پرچہ رکھا تھا جس پر لکھا تھا۔

”اس چیٹر کو ضرور پڑھیں وریشا!“

عمران نے کتاب کے صفحے پر نگاہ ڈالی تو موضوع لکھا تھا ”بیویوں کے حقوق“ وریشا کی تحریر اور احادیث کے موضوع کا عنوان پڑھ کر عمران کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور وہ سوچنے لگے کہ مجھے یہ احادیث پڑھوا کر وریشا مجھے کیا پیغام دینا چاہتی ہیں پھر انہوں نے احادیث کو پڑھنا شروع کیا۔

خاندان کی زندگی کا آغاز شوہر اور بیوی کے پاکیزہ ازدواجی تعلق سے ہوتا ہے اور اس تعلق کی خوش گواری اور استواری اس وقت ممکن ہے جب شوہر اور بیوی دونوں ہی ازدواجی زندگی کے آداب و فرائض سے بخوبی واقف ہوں۔ عورتوں کے حقوق کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلیوں میں سب سے زیادہ اوپر کا حصہ ٹیڑھا ہے اس کو سیدھا کرو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اگر اس کو چھوڑے رہو تو میڑھی ہی رہے گی پس عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔“ (بخاری و مسلم)

ایک اور جگہ ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ”کامل ایمان والے مومن وہ ہیں جو اپنے اخلاق میں سب سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں سب سے اچھے ہوں۔“ (ترمذی)



”تو سن لے پتر..... ایہ سوہتی سردار شاہ دین کی بیٹی ہے۔“ دھیرے سے کہہ گئے لفظوں میں اماں نے گویا دھماکہ کر دیا۔ شاید میں اس دھماکے سے اتنا ترلرزا، جس سے جسم کٹ پھٹ جاتا ہے، میں حیرت

اس پر وہ ذرا سا مسکرائی اور بولی۔  
”دس پندرہ سال پہلے تم یہ سوال کرتے تو شاید

یہ بتانے کی وجہ.....؟“ میں نے پوچھا تو وہ

”میں اپنی ماں کو چھوڑ چکی ہوں، ملک سجاد کچھ















تیری سوچ ہے نا کہ جلدی جلدی سب کو ختم کر دوں  
مجھے اس سے اختلاف ہے دشمن کو وقت دو جسی بھتا  
دے سکتے ہو اس پر اعتبار نہ کرو اسے رخم لگا دو اور پھر  
دیکھو کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہے، کتا اور بندر اپنے  
رخم سے خود مر جاتا ہے۔ رویندر سنگھ کو رخم لگا دیا ہے وہ  
اب سکون سے نہیں بیٹھے گا، اور میں تمہیں بتا دوں اب  
بلجیت سنگھ بھی تمہارے سامنے نہیں آئے گا، کیونکہ  
انہیں یقین ہے کہ یہ سب کچھ تم نے کیا ہے کیسے کیا  
ہے؟ یہ انہیں سمجھ نہیں آ رہی ہے۔“

”اور تمہارا کیا خیال ہے انہیں سمجھ آئی چاہیے  
یا نہیں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”نہیں نا چتے رہیں وہ جب تک انہیں سمجھ آئے  
گی، ہم بہت کچھ کر چکے ہوں گے۔“ ہر پریت نے  
کہا، ”بھی جہاں کا فون نہ اٹھا، وہ جسمیندر کی کال تھی“  
اس نے جلدی سے اپنا لپ ٹاپ اٹھایا اور اسے آن  
کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ آن لائن تھا رابطہ ہوتے ہی  
جہاں نے کہا۔

”یار ان لوگوں کو مجھ پر شک ہو گیا ہے، پولیس  
آفسر آتا تھا اور چھ لفظوں میں دھمکی لگا گیا ہے۔“  
”وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا پیارے۔“ جسمیندر نے  
جواب دیا۔

”وہ کیسے.....؟“ اس نے پوچھا۔  
”وہ ایسے میری جان کہ اگر ثبوت ہوگا، تبھی نا  
کوئی ثبوت نہیں ہے تمہارے بارے میں.....“ اس  
نے جواب دیا۔

”وہ لوگ جو میرے ساتھ تھے.....“ جہاں نے  
اپنا شک اس کے سامنے رکھا۔

”وہ لوگ بھارت میں ہوں گے تو انہیں پکڑیں گے  
ان میں سے کچھ یہاں کنیڈ آ گئے ہیں اور کچھ تھائی لینڈ  
میں ہیں۔ انہیں پتہ تھا کہ کامیاب مہم کے بعد وہ

کر رہے ہوتے یا پھر گانے بجانے والوں میں شامل  
ہو جاتے۔ جسی! ہم لوگ نہیں بنے اس پیار کے کھیل  
کے لیے، محبت ہم لوگوں کو اس نہیں وہ محبت جس میں  
دل دے دیا جاتا ہے، ہمیں تو ایک مقصد کے لیے جینا  
ہے اور اس مقصد کے لیے مرجانا ہے باقی وہ سوہنا  
رب جانے کیا کرتا ہے۔“

”یار تم تو سیریس ہی ہو گئی ہو۔“ جہاں نے  
سنجیدگی سے کہا۔

”تم نے میرے خیالات پوچھے ہیں نا تو سچ  
بتا رہی ہوں۔ میرے لیے یہ جسم اور اس جسم کی لذتیں  
کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتیں، یہ ایک اضافی شے ہے  
جس کا میرے مقصد سے کوئی لینا دینا نہیں ہاں انہیں  
میں اپنے مقصد کے لیے استعمال ضرور کر سکتی ہوں۔  
جس کی ابھی تک مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی،  
کیونکہ مجھے میرے دھرم اور ورثے کی پوری پہچان  
ہے کیا تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ میرے دیر  
انوجیت نے بھی مجھے شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا  
میں تمہارے ساتھ تنہا ہونی ہوں، ایک بیڈ پر تمہارے  
ساتھ سوتی ہوں، کیا تم نے مجھے جذبات کے معاملے  
میں کوئی عام سی لڑکی پایا ہے؟“ وہ پورے جوش سے  
کہتی چلی گئی تھی۔

”پر پتی.....! تو پہلی لڑکی ہے جو میرے اتنے  
قریب آئی ہے یہ محض دل پھینک عاشق کا ڈانٹا لگ  
نہیں اور نہ میں تمہارے سامنے جھوٹ بول رہا ہوں  
وینکوور میں کسی بھی لڑکی کا حصول عام سی بات ہے  
گرل فرینڈ رکھنا تو ایک پالتو جانور سے زیادہ سستا  
ہے میں نہیں جانتا کہ تیرا اور میرا ساتھ کب تک رہے  
گا، لیکن اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ جتنا وقت بھی گزرے  
اچھا گزرے۔“

”واہ گرو بہت بھلی کرے گا تو فکر نہ کرو اور یہ جو



بھارت میں نہیں رہیں گے، اس لیے پوری کوشش کر کے تمہارا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ بڑے کام کے بندے تھے اب چند دنوں تک تیر اور میرا رابطہ نہیں ہوگا اور تو بھی سکون کر، ادھر ادھر پھر موج کر۔“

”تمہارا کیا خیال ہے میں سکون سے رہ پاؤں گا۔“ جہاں نے کہا۔

طرف دیکھ کر بولا۔

بہن نے تھے یا محض چوراہے کے تھے۔ مجھے جب معلوم ہوا تو دو چار فارغ نکالے تھے میں نے پھر بعد میں سکون رہا۔“ بھید نے غفیل سے بتایا اور پھر دودھ ڈالنے لگا۔ جب وہ دودھ ڈال چکا تو سیدھا ہو گیا۔  
”اچھا کیا تو نے مجھے بتا دیا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

تو اس کے پاس چلا جا اور کاندھے پر پرنا رکھ کے.....“ وہ غصے میں پتہ نہیں مزید کیا کہتا، مگر اس سے پہلے ہی میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔  
”بکواس ہی کرتا جائے گا یا جو میں کہہ رہا ہوں اس پر یقین کرے گا۔“  
”یقین تو تیرا ہی کرنا ہے، ہمالے.....“ اس نے اسی طرح لینے لینے جواب دیا۔



دی تو وہ ادھر ہو جائیں گے اس میں بڑا وقت لگے گا تو یہ مت سوچ اس منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی بڑا وقت پڑا ہے اور بہت کچھ کرنا ہوگا جب میں تجھے سوہنی کے یہاں آنے کے بارے میں بتاؤں گا تو پھر مجھے بتانا سمجھ لو سارا کھیل ہی بدل گیا ہے۔“ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ سوہنی کچن میں سے نکلی اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے اٹھ گیا تو وہ مالیہ انداز میں بولی۔

”بھال.....! ناشتہ تو کرلو.....؟“

”میں ہاتھ دھواؤں۔“ میں نے آہستگی سے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”تم ہمیں بیٹو! میں دھوا دیتی ہوں ہاتھ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹرے چارپائی پر گئی جہاں چھابا کا اب اٹھ بٹھا تھا وہ بڑے غور سے سوئی کو دکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس بھری حیرت تیر رہی تھی۔ وہ ٹرے رکھ کر پلٹ گئی تو میں پانسی کی طرف چارپائی پر بیٹھ گیا، ابھی چھابا بولا۔

”یار.....! کیا جاو کر دیا ہے تو نے اس پر ایسی خدمت.....؟“

”ناشتہ کر لے پھر بتاتا ہوں، ورنہ یہ کھانا پینا ہمیں بھول جائے گا۔“ میں نے پھر آہستگی سے کہا تو وہ بے چین ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ سوہنی آئی اور میرے ہاتھ دھلوا کر چلی گئی۔ جب ہم ناشتہ کر چکے اور چائے کی پیالیاں خالی کر کے رکھ دیں تو میں نے باہر والے کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کر کے اٹھ گیا۔ چھکا بھی میرے پیچھے پیچھا گیا۔ اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد میں سوہنی کی بتائی ہوئی بات اسے بتادی۔ تو حیرت کی انتہا پر بولا۔

”یہ تو غضب ہو گیا جمالے..... سوہنی سردار شاہ دین کی بیٹی ہے؟“

وہ علاقے میں مزید گندے ہو جائیں گے۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”یہ صرف تو سوچتا ہے نا، جس نے اپنا کام دکھانا ہے، وہ دکھا جائے گا، ہو سکتا ہے ملک سجاد کے بندے آگئے ہوں..... یا سارواری کوئی اور کھیل کھینا چاہتا ہو۔ وہی جو ہم نے ان کے ساتھ کیا۔“ چھاکے نے ایک پہلو کے بارے میں توجہ دلائی تو مجھے خیال آیا۔

”یار!..... اب تک رندھاوے نے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا ممکن ہے باہر ہی باہر سے معاملہ ہی کچھ دوسرا ہوگا ہو۔“

دلیبر کے گھر کے باہر کافی سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ گاؤں کے تھے اور ادھر ادھر کے علاقے سے آئے ہوئے تھے وہ کبھی زمین پر کچھی ہوئی دریاں پر تھے۔ چھاکے نے ایک طرف بایک دیکھ کر مٹھیوں میں اترا اور جاکر ان میں بیٹھ گیا۔ فاقہ پر دھڑی اور محراب محمول باتیں ہونے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ میری طرف بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ گاؤں سے باہر ہی کے لوگ تھے۔ چھاکا اس وقت تک دلیبر کے گھر کے اندر چلا گیا تھا کیونکہ اس وقت تمام تر معاشی معاملات اس کے سپرد تھے۔ میں خاموشی سے وہاں بیٹھا رہا اور لوگوں کی

باتیں سنتا رہا۔ وہاں یہ شکوہ موجود تھا کہ پیر زادے آکر چلے گئے علاقے کے دوسرے زمیندار بھی کسی نہ کسی طرح انہیں پرسہ دینے آئے لیکن اپنے ہی گاؤں کے سردار نہیں آئے۔ سردار شاہ دین نہیں آیا نہ ہی لیکن شاہ زیب کو لیک باران کے ہاں آنا چاہیے تھا۔ میں نے وہاں کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی کرنے کی ضرورت تھی۔ چاہے دہلی دہلی زبان ہی میں سہی سرداروں کے خلاف لوگ بولنا شروع ہو گئے تھے۔ لوگ آتے جاتے رہے اور میں وہیں بیٹھا رہا، دوپہر ہونے لگا گئی تھی جب سرداروں کا خاص ملازم فخر وہاں آ گیا۔ روایت کے مطابق اس نے فاتحہ پڑھی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ لوگوں نے دبے دبے لفظوں میں اس سے سرداروں کے نہ آنے کا گلہ بھی کیا اس نے بتایا کہ بڑے سردار صاحب تو شہر میں ہیں اور وہاں بہت مصروف ہیں جبکہ شاہ زیب لاہور گیا ہوا ہے۔ اپنے داخلے وغیرہ کے سلسلے میں۔ وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق دونوں حویلی میں تھے۔ نجانے کیوں میرے دماغ میں اس کا جھوٹ کھنکنے لگا۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے؟ ممکن ہے سردار شاہ دین چلا گیا ہو ملک سجاد کی حالت خاصی خراب تھی۔ مجھے یہ سوچ آنے لگی کہ اگر فخر درست کہہ رہا ہے تو پھر کم از کم سرداروں کی طرف سے خطرے والی بات نہیں ہے، میرے بارے میں جو لوگ پوچھتے پھرتے ہوں گے وہ کوئی اور ہوں گے، لیکن اگر فخر جھوٹ بول رہا ہے تو پھر مجھے کسی نئی صورت حال کے لیے پوری طرح تیار ہونا چاہیے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک دم مجھے خیال سوچھا، کل آنے سے پہلے ہی پچل سجاد جی جائے۔ میں فخر کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ گیا انہی لمحات میں جبکہ وہ آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا میں تیزی سے اٹھا اور جوتے پہن لیے۔ فخر د



آرام سے جوتے پہن کر چند قدم چلا ہی تھا کہ میں اس کے برابر جا کر بولا۔  
”فخر و.....! سردار شاہ دین تو گھر میں ہے تو نے وہاں جھوٹ کیوں بولا۔“

میرے یوں کہنے پر اس نے طنز یہ انداز میں مجھے دیکھا اور پھر بولا۔

”تجھے زیادہ پتہ ہے یا مجھے جو میں ہر وقت حویلی میں رہتا ہوں۔“

”حویلی میں رہنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم جھوٹ ہی نہ بولو خیر.....! ایک بات تو بتاؤ فخر؟“

”بولو.....“ اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جوانی میں سردار نے خوب دولت لٹائی ہوگی“ طوائفوں کے پاس بھی جاتا ہوگا۔“

”سردار صاحب نے دولت لٹائی یا طوائفوں کے پاس گیا، تمہیں اس سے کیا لینا دینا؟“ اس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

”بہت کچھ لینا دینا ہے فخر، بہت کچھ..... اتنا کچھ کہ تم اور تیرے سردار تصور بھی نہیں کر سکتے، خیر.....!“

تم جاؤ اور جا کر بڑے سردار صاحب کو میرا پیغام دے دو کہ اس کی بیٹی میرے پاس ہے اور.....“

”کیا کیوں کر رہے ہو تم..... سردار صاحب کی کوئی بیٹی نہیں تمہیں بھی معلوم ہے اور سارے.....“

”جو اس بند کفر و اور صرف میری بات سن۔“ میں نے اچانک ہی بھناتے ہوئے کہا تو وہ میری طرف الجھتے ہوئے انداز میں دیکھ کر بولا۔

”کہو.....!“

”اس کی بیٹی ہے ناجائز بیٹی۔ تفصیل معلوم کرنی ہو تو ملک سجاد سے پوچھ لے..... جو اس کی بیٹی

کا عاشق تھا۔ جو تیرے سردار کا گہرا یار ہے۔ پھر بھی پتہ نہ چلے تو مجھ سے پوچھ لینا، لیکن تم نے نہیں آنا بلکہ اپنے سردار کو بھیجنا۔“ میں نے غصے میں کہا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”جمال.....! تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں سچ کہہ رہا ہوں..... کل صبح تک کا وقت ہے تیرے سرداروں کے پاس، ورنہ..... کل یہیں جب دلبر کے لیے پورے علاقے سے لوگ آئیں گے تو ان میں سردار شاہ دین کی بیٹی بھی آجائے گی اور اگر یہاں نہ آئی تو پورے علاقے کی پچاسائیت ہلا کر اس میں وہ بتائے گی کہ وہ کس طرح شاہ دین کی بیٹی ہے جاؤ اور جا کے بتاؤ اسے وقت بہت کم ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا اور پلٹ کر بایک لینے کے لیے چل دیا۔ فخر و چند لمحے وہیں حیرت میں گم کھڑا رہا پھر تیز قدموں سے چل پڑا۔

مجھے اس وقت اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ اس نے ابھی تک ملک سجاد کے بارے میں نہیں پوچھا کہ وہ اس وقت کس حالت میں ہے۔ اسے ہوں آ گیا ہے یا ابھی تک بے ہوش ہے۔ خطرے میں ہے یا خطرے سے باہر میں چاہتا تھا کہ سوہنی کے بارے میں ملک سجاد ہی اسے بتائے تاکہ اسے پوری کہانی خود بخود معلوم ہو جائے مجھ پر اعتبار کرتے ہوئے شاید اسے وقت لگے۔ میں نے چھپا کے کا انتظار کیے بغیر اچھو کر پانے والے کی دکان پر جا کر فون کرنے کا سوچا۔ دو گلیاں پار کر کے اس کی دکان تھی۔ میں نے بایک اشارت کی اور اس طرف بڑھ گیا۔ دکان پر چند گاڑے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے انتظار کرنا چاہا مگر اچھو فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”جی بھائی فون کرنا ہے.....“

”وہی فون نمبر ملادے۔“ میں نے کہا تو اس نے

سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے فوراً ہی نمبر ملادیے اور پھر ریسپور مجھے تھمادیا۔ میں نے ریسپور کان کو لگا یا اور رابطہ ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد فون بیک کر لیا گیا۔ مگر دوسری جانب سے آواز ملک سجاد کی نہیں تھی۔ ابھی میں نے کہا۔

”مجھے ملک سجاد سے بات کرنی ہے۔“

”جی ان سے بات نہیں ہو سکے گی، وہ اس وقت اسپتال میں ہیں۔“ دوسری طرف اسے کافی حد تک انفرادی میں کہا گیا تو میں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

”خیر تو ہے کیا ہوا ہے انہیں۔“

”ایک حادثہ ہو گیا تھا اس میں انہیں شدید چوٹیں لگی ہیں۔ زخمی بھی ہو گئے تھے۔“

”اوہ.....! خطرے والی کوئی بات تو نہیں میرا مطلب ہے وہ ٹھیک تو ہیں نا۔“ میں نے اپنے لہجے کو جان بوجھ کر تشویش زدہ کر لیا۔

”خطرے والی بات تو ہے، لیکن بہر حال اب وہ ہوش میں ہیں۔ ڈاکٹر نے بات چیت اور ملنے ملانے سے منع کر رکھا ہے دو چار دن میں ان سے رابطہ ہو جائے گا ویسے آپ کون اور کہاں سے بات کر رہے ہیں.....؟“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ مجھے مزید بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو اپنے گاڑوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا اس لیے پلٹا اور بایک کی طرف بڑھنے لگا۔ تب اچانک بائیں جانب سے چند لوگ بڑھے اور

میں نے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب مجھ پر پل پڑے۔ میں بایک نگاہ ہی انہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی تھے جو دلبر کے گھر کے سامنے کچھ دیر پہلے میں نے دیکھے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں لاثھیاں ڈنڈے اور ہاکیاں تھیں۔ ان میں سے کوئی چہرہ بھی نورنگر کا نہیں تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ وہ کتنے تھے، بس اندازہ ہے کہ سات سے دس تک ہوں گے۔ پہلی ہاکی کی ضرب میری پشت پر کاندھوں کے پاس لگی۔ پھر ہاکیوں ڈنڈوں اور لاثھیوں کی یلغار ہو گئی۔ میں ان کے حصار میں تھا ان سے بچنے کا یہی طریقہ میرے ذہن میں آیا کہ سب سے پہلے میں ان کا حصار توڑ دوں پھر جب وہ سامنے آجائیں تو میں کچھ کر پاؤں۔ میں نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھے اور ایک دم زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے ان کے درمیان سے ہو کر گئی کی جانب بڑھا، میں ان کا حصار توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسے میں ایک نے لاثھی مارنے کو بلندی تو میں اس پر جا پڑا دونوں ہاتھوں کے پورے زور سے اس کی لاثھی کو ایک جھٹکا دیا۔ تب تک دو چار ضربیں میرے لگ گئی تھیں۔ لاثھی میرے ہاتھ میں آ گئی تو میرے اندر ایک حوصلہ آ گیا۔ میں چاہے اب وار کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن اپنا کچھ نہ کچھ دفاع تو کر سکتا تھا چند منٹ تک میں اپنا دفاع کرتا رہا لیکن کب تک میں نے لاثھی کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں لیا اور دائیں ہاتھ سے اپنا پٹشل نکالنا چاہا یہی لمحہ میرے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ اچانک ہی دو چار بندوں نے مجھے بری طرح جکڑ لیا۔ میں ان کے حصار سے نکلنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا، مگر نہ نکل سکا وہ بھی زور لگتے تھے۔ ایسے میں ایک کیری ڈبہ ان کے پاس آ گیا۔ انہوں نے آؤ دیکھنا تاؤ میرے پیروں کی طرف سے پکڑ کر مجھے اٹھالیا میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے اغوا کر کے لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے پوری قوت لگا کر ان کی گرفت سے نکلتا چاہا مگر نہ نکل سکا۔ تب تک کیری ڈبے کا دروازہ کھلا اور مجھے اس میں پھینک دیا گیا۔ میرے چوٹیں تو آئیں مگر میں نے

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ مجھے مزید بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو اپنے گاڑوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا اس لیے پلٹا اور بایک کی طرف بڑھنے لگا۔ تب اچانک بائیں جانب سے چند لوگ بڑھے اور

میں نے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب مجھ پر پل پڑے۔ میں بایک نگاہ ہی انہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی تھے جو دلبر کے گھر کے سامنے کچھ دیر پہلے میں نے دیکھے تھے۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ مجھے مزید بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو اپنے گاڑوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا اس لیے پلٹا اور بایک کی طرف بڑھنے لگا۔ تب اچانک بائیں جانب سے چند لوگ بڑھے اور

میں نے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب مجھ پر پل پڑے۔ میں بایک نگاہ ہی انہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی تھے جو دلبر کے گھر کے سامنے کچھ دیر پہلے میں نے دیکھے تھے۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ مجھے مزید بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو اپنے گاڑوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا اس لیے پلٹا اور بایک کی طرف بڑھنے لگا۔ تب اچانک بائیں جانب سے چند لوگ بڑھے اور

میں نے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب مجھ پر پل پڑے۔ میں بایک نگاہ ہی انہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی تھے جو دلبر کے گھر کے سامنے کچھ دیر پہلے میں نے دیکھے تھے۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ مجھے مزید بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو اپنے گاڑوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا اس لیے پلٹا اور بایک کی طرف بڑھنے لگا۔ تب اچانک بائیں جانب سے چند لوگ بڑھے اور

میں نے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب مجھ پر پل پڑے۔ میں بایک نگاہ ہی انہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی تھے جو دلبر کے گھر کے سامنے کچھ دیر پہلے میں نے دیکھے تھے۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ مجھے مزید بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو اپنے گاڑوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا اس لیے پلٹا اور بایک کی طرف بڑھنے لگا۔ تب اچانک بائیں جانب سے چند لوگ بڑھے اور

میں نے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب مجھ پر پل پڑے۔ میں بایک نگاہ ہی انہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی تھے جو دلبر کے گھر کے سامنے کچھ دیر پہلے میں نے دیکھے تھے۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ مجھے مزید بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو اپنے گاڑوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا اس لیے پلٹا اور بایک کی طرف بڑھنے لگا۔ تب اچانک بائیں جانب سے چند لوگ بڑھے اور

میں نے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب مجھ پر پل پڑے۔ میں بایک نگاہ ہی انہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی تھے جو دلبر کے گھر کے سامنے کچھ دیر پہلے میں نے دیکھے تھے۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ مجھے مزید بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو اپنے گاڑوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا اس لیے پلٹا اور بایک کی طرف بڑھنے لگا۔ تب اچانک بائیں جانب سے چند لوگ بڑھے اور

میں نے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب مجھ پر پل پڑے۔ میں بایک نگاہ ہی انہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی تھے جو دلبر کے گھر کے سامنے کچھ دیر پہلے میں نے دیکھے تھے۔







پہل نہیں ہوئی ہوگی؟ کیا چھاکے کو معلوم نہیں ہوا ہوگا؟ ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہاں گاؤں میں پتہ چل گیا ہوگا، لیکن اس میں شک کیا جاسکتا تھا کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ میں کہاں ہوں چلتے چلتے اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ کیا مجھے تشدد سہتے رہنا چاہیے؟ اور پولیس کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ کب آئے اور مجھے لے جا کر ”پار“ کر دیں۔ کیا میں اتنی آسانی کے ساتھ موت کے منہ میں چلا جاؤں گا؟ کیا رندھاوا بھی اب تک میرے ساتھ دہری چال چلتا آیا ہے ایک طرف اس نے اپنے آفیسر کے ساتھ مل کر ملک سجاد اور سرداروں کو بتادیا کہ وہ بہت کچھ کر سکتا ہے اور دوسری طرف اس نے مجھ سے سب کچھ کروا کر مجھے ہی نشانہ بنانے کے لیے ماحول بنادیا۔ بلاشبہ اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا تھا۔ اس وقت پے درپے میرے ذہن میں یہ سوال آتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ جیسے سارا ماحول ہی میرے خلاف سازش کر چکا ہے۔ مایوسی تھی کہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ایک طرف میں نے ملک سجاد جیسے بندے کو موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا یہ خیال آتے ہی میرے اندر ایک دم سے حوصلہ ابھرا۔ میں نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے لوگوں پر نگاہ ڈالی وہ تین ہی تھے۔ باقی شاید کہیں ہوں اچانک میری نگاہ ایک ایسے بندے پر پڑی جس کے ہاتھوں میں دیسی ساخت کی ایک کاربین تھی تب میں نے لمحوں ہی میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے میں نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ کاربین والا میرے دائیں ہاتھ پر ذرا سا آگے چل رہا تھا۔ ایک میری بائیں جانب ساتھ چل رہا تھا اور ایک میری پشت پر تھا ممکن تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو مگر میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا تھا، کاربین والا کارڈور کے ستون سے چند قدم پیچھے تھا جیسے ہی

”ایسے ہی پڑے رہنا رو نہ بھیجا نکال دوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے تیزی سے اس کی تلاشی لی، میرا کلٹ پسل اس کی ڈب میں تھا۔ میں نے وہ نکال لیا، وہ وہیں دبکا ہوا تھا میں نے انہیں قابو تو کر لیا مگر اب انہیں سنبھالنا مشکل لگ رہا تھا۔ ستون سے ٹکرانے والا اپنے حواس بحال کر رہا تھا جبکہ دائیں جانب والا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا میں نے پسل اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”آگے چل.....!“ پھر کھڑے ہوتے ہوئے نیچے پڑے بندے کو پاؤں کی ٹھوک مارتے ہوئے کہا۔ ”چل“ اوئے، تو بھی اٹھ..... آگے لگ.....“

میں نے ان دونوں کو آگے لگالیا یہ سب کچھ تقریباً ایک سے ڈیڑھ منٹ کے دورانیے میں ہوا وہ میرے آگے آگے چارے تھے اور میں ان کے پیچھے تھا آگے ڈیڑھ سی چند گز کے بعد گیٹ تھا جبکہ کارڈور آگے تک تھا۔ میں اچانک ہی مڑا اور ڈیڑھ سی چلا گیا سامنے ہی دو گن بردار چوکیدار تھے، مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گنیں سیدھی کیں انہوں نے تو گن سیدھی کر کے ٹرائیگر دبانا تھا جبکہ میں نے یکے بعد



دیکرے دو فائر کر دیئے وہ بدحواس ہو کر باہری جانب بھاگے، میں تیزی سے گیٹ تک گیا، ممکن تھا کہ وہ گیٹ پر دائیں بائیں چھپے ہوتے اور میرے باہر نکلتے ہی فائر کر دیتے، میں نے پہلے دائیں جانب فائر کیے اور پھر بائیں جانب اور اگلے ہی لمحے جست لگا کر گیٹ سے باہر آ گیا۔ میرا اندازہ درست تھا، دائیں طرف والا گارڈ زمین پر پڑا ہوا تھا اور بائیں جانب والا دکھائی نہیں دیا۔ میں پھر وہاں نہیں رکا، جس قدر تیزی سے بھاگ سکتا تھا بھاگتا چلا گیا، میں نے زیادہ سے زیادہ تین یا چار ایکڑ کا فاصلہ طے کیا ہوگا، ڈیرے کی چھت سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے پلٹ کر ایک نگاہ دیکھا تھا۔ ڈیرے سے کئی بندے باہر کی جانب بھاگتے ہوئے نکل رہے تھے۔ بلاشبہ انہوں نے مجھے پکڑنا تھا۔ میں بھاگتا چلا گیا۔ میں کسی نہ کسی طرح پکی سڑک تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں فصلوں کے درمیان سے آگے بڑھتے رہنا چاہتا تھا۔ وہاں سے گاؤں تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اگر گھوم کر جاتا تو زیادہ وقت لگتا۔ میں بغیر رکے بھاگتا جا رہا تھا، میرے بدن میں سخت ختم ہو رہی تھی۔ نجانے جب بقا کا مسئلہ درپیش ہو تو قوت کہاں سے آ جاتی ہے اب فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ میں ہانپتا ہوا پکی سڑک تک پہنچ گیا۔

جہاں یہ ممکن تھا کہ وہاں مجھے کوئی جاننے والا مل جاتا۔ ویسے یہ بھی تھا کہ میرے دشمن میری تاک میں ہوں یا اگر میں گاؤں کی طرف جاتا تو راستے میں حویلی تھی ورنہ شہر جانے والی سڑک تو تھی ہی، مجھے ادھر جانا تھا اس وقت میں ان لوگوں کی دسترس سے نکلنا چاہتا تھا، میں ایک درخت کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی سائیس بحال کرنے لگا، میری پشت پر پکی سڑک اور رخ اس طرف تھا جہاں سے میں

بھاگ کر آیا تھا۔ مجھے اپنی سائیس بحال کرنے میں چند منٹ لگے۔ میں درخت کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ ارد گرد جھاڑیاں اور پودے آگے ہوئے تھے۔ میری نگاہ پکی سڑک پر تھی کہ کوئی تو جاننے والا ادھر سے گزرے گا۔ تب اچانک مجھے دور سے پولیس جیب اور اس کے پیچھے وین نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی شاہ زیب کی بات میرے ذہن میں گونج گئی کہ پولیس مجھے ”پار“ کرنے کے لیے پہنچنے ہی والی ہے کیا رندھاوا مجھے ڈبل کر اس کر گیا یا پھر معاملہ ہی کچھ اور ہے؟ وہ سڑک پر سے گزر گئے۔ اب میرے لیے وہاں پر بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں اٹھ کر پکی سڑک پر آ گیا۔ میں حیران تھا کہ مجھے تلاش کرنے کے لیے کوئی بھی نہیں نکلا ہے۔ میں سڑک کی دوسری طرف چلا گیا۔ مجھے وہاں کھڑے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ میرے ہی گاؤں کا ایک لڑکا فیض موٹر سائیکل پر آتا نظر آیا۔ مجھے یوں کھڑا دیکھ کر اس نے موٹر سائیکل روک لیا۔

”جمال بھائی، یوں کیسے کھڑے ہو، خیر تو ہے.....؟“

”تو کہاں سے آ رہا ہے؟“ میں نے پوچھا، کیونکہ مجھے لگا جیسے اسے میرے اغوا کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ بھی وہ بولا۔

”تھبے گنا تھا رات وہیں تھا۔“

”اچھا چل، مجھے گاؤں چھوڑ دے۔“ میں نے اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا، وہ چل پڑا۔ ابھی ہم چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ سامنے سے کئی موٹر سائیکلوں پر سوار مجھے میرے دوست نظر آئے۔

”چھا کا، ان میں سب سے آگے تھا، انہیں دیکھتے ہی میں نے کہا۔ ”رک جا فیض۔“

اس نے موٹر سائیکل روک دی۔ اگلے دو تین

منٹوں میں وہ قریب آ گئے۔

”کون تھے وہ.....؟“ چھا کے نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

”شاہ زیب.....“ میں نے دھیرے سے کہا تو چھا کا ایک دم سے بھنا گیا۔

”چل.....! کدھر ہے وہ..... میں دیکھتا ہوں اس کی سرداری۔“

”نہیں ابھی نہیں۔ ادھر ابھی پولیس ہے..... وہ ہمارے حق میں نہیں واپس چل آج شام سے پہلے نہیں دیکھ لیں گے۔“ میں نے کہا اور چھا کے کے پیچھے بیٹھ گیا۔

گاؤں کے چوک تک پہنچتے پہنچتے سب کو خبر ہو گئی کہ مجھ پر حملہ کرنے والے سردار شاہ دین کے بندے تھے۔ وہیں برگد کے درخت تلے کئی لوگ تھے ان میں چاچا رحمت بھی تھا جو ہمارے گاؤں کی پنچائیت کا ایک اہم رکن تھا۔ ساری روداد سننے کے بعد اس نے کہا۔

”تو ٹھیک کہتا تھا، ان کی غنڈہ گردی اب بہت بڑھ گئی ہے۔“

”ابھی تو شروعات ہوئی ہے، اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو ہمارے بچے ان کے غلام ہوں گے۔ جیسے آج ہم بول نہیں سکتے۔“

”پتر.....! تو جو بھی کہہ ہم تیری بات پر آمین کہتے ہیں۔ سرداروں کو پتہ چلنا چاہیے کہ ہم ڈنڈے نہیں انسان ہیں۔“ چاچے نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”چاچا.....! تو نے کہہ دیا اور اب میں اس گاؤں کے لوگوں کی عزت بناؤں گا تو دیکھتا رہ اب میں کیا کرتا ہوں ان سرداروں کے ساتھ۔“

”تجھے اجازت ہے۔“ اس نے کہا تو گاؤں کے لوگ میری پیاں میں ہاں ملانے لگے۔ اس وقت دوپہر ہو گئی تھی جب میں گھر کی طرف چلا، چھا کا

بہت غصے میں تھا۔ وہ مجھے دروازے پر ہی اتار کر واپس چلا گیا۔ میں گھر میں داخل ہوا تو نیم کے درخت تلے چار پانی پٹھیاں بیٹھی ہوئی تھیں وہ آنکھیں بند کیے تیج پڑ رہی تھیں۔ جبکہ سوہنی دالان میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میری جانب بڑھی۔ اس کا بے ساختہ انداز دیکھ کر میں نے اماں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ میں اماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں، پھر مجھے غور سے دیکھ کر جذباتی لہجے میں بولی۔

”آ گیا میرا بچہ.....“

”ہاں اماں..... بہت چوٹیں آئی ہیں۔“ میں نے کسی بچے کی طرح ماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا تو وہ میرا سر تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

”چوٹیں بھی تو شیر جوانوں کو لگتی ہیں۔ چل اٹھ منہ ہاتھ دھو کر آ، میں تجھے کھانا دوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھین۔ سبھی سوہنی فریب آ کر حیرت سے بولی۔

”اماں.....! دشمن اسے اغوا کر کے لے گئے تھے اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا، لیکن اماں تم تمہارا رویہ ایسے ہے جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو.....؟“

”تو کیا میں اسے ڈراؤں.....“ اماں نے کہا اور بچن کی جانب چل دی۔ میں نے سوہنی کی طرف دیکھا اور اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھا لگئی۔

”کون تھے وہ لوگ..... کچھ پتہ چلا.....“

”شاہ زیب تھا۔“ میں نے سرسری انداز میں بتایا تو وہ چوتکتے ہوئے بولی۔

”اوہ.....! تو میرا شک درست نکلا..... میں نے بھی سردار شاہ دین سے کہہ دیا۔“

”کیا..... کیا کہہ دیا..... تیری بات ہوئی اس سے.....“ میں نے چوتکتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔



**نہ اُفق ۱66 اگست 2013ء**







ایک ریزورٹ میں رہو گے اور جاتے ہوئے تم

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

”مجھے نہیں سمجھ آ رہی کہ آپ وہاں کیوں ٹھہریں۔“

-----  
عید مبارک عید مبارک عید مبارک 2013ء







بہت کچھ کر سکتا ہوں، میں اس کی غلطی مان رہا ہوں  
 نا۔“ سردار نے لجاجت سے کہا۔

”سردار جی آپ نے اگر کوئی دوسری بات کرنی ہے تو کریں، مجھے معلوم ہے کہ میرے نہ ماننے سے

آپ نے کیا پلان کیا ہوا ہے۔ آپ نے جو فوج سڑک پر کھڑی کی ہوئی ہے نا وہ میری نگاہ میں ہے، وہ فوج بھیجیں میں نے اس کا توڑ بھی کیا ہوا ہے، میں نے بچپن سے اب تک آپ ہی کی نفسیات کو سمجھا ہے، کیوں سمجھا ہے یا آپ بخوبی جانتے ہیں۔“

اسے میری مجبوری سمجھ کر کہ میں چل کر تیرے کھر  
آ گیا ہوں، اپنی حد سے باہر ہو رہا ہے۔ اپنے آپ پر  
سوچ اپنی بوشی ماں پر رحم کر..... تو جو مانگتا ہے میں  
تجھے دے دیتا ہوں، لیکن نہ سارا تماشا ختم کروں جو

میری بیٹی ہونے کی دعویٰ دار بنی پھرتی ہے اسے لے کر کہیں چلا جا، اس تماشے کو زیادہ لمبا کرو گے تو کچھ حاصل نہیں ہونے والا میں.....“ وہ سمجھنا چاہ رہا تھا کہ سوہنی اندرا گئی۔ وہ پورے لباس میں تھی اور آٹھنچل سے سر ڈھکا ہوا تھا۔ سردار نے گھوم کر اسے دیکھا اور لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ وہ بولی۔

”کتنا ظالم معاشرہ ہے تمہارا، ایک عورت کو کھلونا سمجھا اور دوسری عورت جو اس کی بیٹی ہے اس سے انکار کرتے ہو۔“

”تم جو کوئی بھی ہو جس کسی کی بھی سازش لے کر یہاں تک آئی ہو میں وہ.....“

”اب مجھے تیرے جیسے شخص کو باپ کہنے پر شرمندگی ہو رہی ہے میں نے سوچا تھا کہ شاید تیرے اندر کا خون جوش مارے گا، لیکن نہیں..... ایسا نہیں ہے اپنی اولاد کو دیکھ کر تو والدین کا من تڑپ اٹھتا ہے شاہ زیب تیرا بیٹا ہے اور میں نہیں.....“ اس نے

محض دولت کے لئے آخر طوائف ہے نا.....  
میں نے کچھ عرصہ کی مہلت لی ہے اس سے میں نے

اپنا آپ فروخت کیا ہے اپنی ماں کو..... میں نے کہا  
اگر میں ایک خاص عرصے تک اسے، اس کی سوچی  
ہوئی دولت سے گننا نہ دے دوں اس وقت تک وہ  
مجھ پر اپنا کوئی فیصلہ مسلط نہیں کرے گی۔ ٹیسٹ نے  
ثابت کر دیا کہ تم میرے باپ و ہواور میں تمہاری ناجائز

اولاد.....“ سوہنی بہتی چلی گئی۔ آخری لفظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں انتہائی نفرت اتر آئی، ابھی وہ چیخا۔  
”یہ جھوٹ ہے، فراڈ ہے ایسا کچھ بھی نہیں ہے“  
میں اسے غلط ثابت کر دوں گا۔“

”میں تو کہتی ہوں کہ تم مجھے غلط ثابت کرو، میں اس عذاب سے نکلنا چاہتی ہوں کہ میں کوئی شریف زادی ہوں، میڈیا حاضر ہے، وہاں غلط ثابت کرو، عدالت میں غلط ثابت کرو یا پھر اچھی اور اسی وقت میری زبان بند کر دو، مار دو مجھے۔“ سوہنی نے بھی اسی طرح چپختے ہوئے کہا۔ سردار آنکھیں پھاڑے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا کرے، پھر سکون سے بولا۔

”تم اب بھی ہوش کرو اور چلی جاؤ یہاں سے“  
خیریت اسی میں ہے۔“

”کل کا سورج کس کے لیے کیا لائے گا نہ  
جانتے ہو اور نہ میں..... اور ابھی تم اتنے بڑے حاکم  
نہیں بنے کہ مجھے یہاں اس گھر سے نکال دو جہاں تم  
خود سوالی بن کر کھڑے ہو جاؤ اور جا کر مجھے مارنے  
کے لیے بندے بھیج دو کیونکہ میں تو یہاں آئی ہی

مرنے کے لیے ہوں۔ اور سنو..... میں یہاں لٹری  
اتفاق رکھتی ہوں کہ تمہیں یہاں سے جانے کے  
لیے کہہ دوں۔“

”تم حد سے بڑھ رہی ہو لڑکی.....“ سردار کو جلال

ایکٹ 2013ء عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نئے افق 175 اگست 2013ء عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نئے افق 174 اگست 2013ء



نئے افق 177 اگست 2013ء



پل بہت سوچ سمجھ کر اور بہت خوشی سے گزار دینا چاہتی ہوں۔“

ایسے ہی لمحے میرے دماغ میں اچانک ایک خیال رینگ گیا جس کے تحت میں نے اس کی کمر میں اپنا بازو ڈالتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگالیا، پھر اس کی گردن پر دھیرے سے اپنے گال مس کرتے ہوئے کہا۔

”بس ساتھ چلنا، بوجھ مت بننا۔ چلتے چلیں جائیں گے۔“

کیونکہ وہ معطل ہو گیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، کوئی نیا بندہ آ گیا ہے یہاں۔“ میں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا۔

”لگتا تو ایسا ہی ہے لیکن مجھے پیر زادوں کی خاموشی اچھی نہیں لگ رہی ہے۔“ چھا کے نے مجھے اشارے میں بتایا تو میں نے چار پائی پر پھیلے ہوئے کہا۔

”چھوڑو یا، کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیا ہے تو

میرے یوں کہنے پر اس نے مجھے زور سے ہنسنے لیا، جس کے باعث دوپہر کی لگی چوٹیں ایک بار پھر سے جاگ اٹھیں۔ اس کی گرم جوشی سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر خوش ہے۔ اب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ خوشی کیسی تھی، میں نے دھیرے سے اسے الگ کیا اور بڑی نرمی سے بولا۔

”اب مجھے جانے دو، ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔“ اس نے کچھ نہیں کہا، صرف مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتی رہی میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا بلکہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے چلا گیا۔ پہلی نگاہ میں اماں مجھے دکھائی نہیں دی، جب غور سے دیکھا تو وہ دالان میں جائے نماز بجھائے سجدے میں تھیں۔ میں نے بائیک اٹھائی اور باہر کی طرف نکلتا چلا گیا۔ حالانکہ میرا جسم دوپہر کی چوٹوں سے دُکھ رہا تھا۔

گاؤں سے باہر ایک مخصوص ٹھکانے پر چھپا کا  
سب دوستوں کے ساتھ تیار بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے  
جا کر بانک رو کی تو وہ تیزی سے بولا۔

”حویلی میں اچھی خاصی پولیس آگئی ہے۔ لگتا ہے انہوں نے بہت زیادہ سیکورٹی کر لی ہے اپنی۔“

”لیکن تو مجھے یہ بتا، رندھاوے کی کوئی خبر نہیں، اس کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی۔“ میں نے پوچھا

کرنا چاہتا ہے۔ سوہنی سردار شاہ دین کی بیٹی ہے۔ یہ ثابت ہوتا یا نہ ہوتا لیکن علاقے کے لوگوں کو اک نیا موضوع مل جاتا اور محافلین تو اس بات کو اچھا لیتے۔ میری سوچ اپنی جگہ رہ گئی اور ساری تیاری دھری

کی بھری۔ کل دن چڑھے دلبر کے ایصالِ ثواب کے لیے علاقے کے بہت سارے لوگ آنے والے تھے۔ انہیں جو گردش کرتے کرتے واقعات کی صورت اختیار کر گئی تھیں اس نے دلبر کے قتل کو بہت سنی خیر بنایا ہوا تھا۔ وہاں بہت سارے لوگ اکٹھے ہونا تھے اور میری کوشش تھی کہ میں وہاں پر اپنا سوال رکھوں شاہ زیب کو اغوا کیے بغیر میرا مقصد حل ہو رہا تھا۔

”اوپر اب کیا کرنا ہے، ہمیں تو بتاؤ۔“ میرے ہی ایک ساتھی نے اکتا ہٹ سے کہا تو میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”اس وقت شاہ زیب کا اغوا بہت مشکل ہے بہت ساری سیکورٹی ہے ایویں خواہ خواہ بندے مروانے والی بات ہے، میرا خیال ہے کہ آج رہنے دیں۔“ میں نے اپنی صلاح دے دی تو کچھ دیر بحث کے بعد سبھی نے مان لیا کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔

”تو پھر کیا کریں، یہیں پڑے رہیں۔“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”ہمیں اپنے اپنے گھر چلیں۔ مناسب موقع دیکھتے ہی.....“ میں نے کہا تو میرے دوست اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور وہاں سے نکلے گئے پھر کچھ دیر بعد میں اور چھا کا وہیں رہ گئے۔ ذرا ٹھہر کر ہم بھی وہاں سے نکل پڑے۔ پھر تقریباً ساری رات کسی بھی صورت حال کے لیے منتظر رہے مگر کچھ نہ ہوا۔

اس وقت سورج نہیں نکلا تھا، لیکن صبح کا نور ہر جانب پھیل چکا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کی نیند لے میں بیدار ہو چکا تھا اور ٹھنڈے پانی سے نہا کر اپنی کسلبندی دور کر چکا تھا جب ہمارے گھر کا گیٹ بجائ میں لاشعوری طور پر کسی بھی غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار تھا۔ میں نے اپنا پسٹل ہاتھ میں لیا اور

گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے گیٹ کی جھری سے باہر جھانکا، تو مجھے ایسا خوف و کھڑا کھائی دیا۔ میں نے محتاط انداز میں گیٹ کھولا تو فرخ نے کہا۔  
”اچھا ہوا تو گھر پر ہی مل گیا۔ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”میں باہر والا کمرہ کھولتا ہوں۔“ میں نے کہا اور گیٹ بند کر کے اندر آیا۔ اس وقت تک سوہنی حسن میں آکر متحس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا اور باہر والا دروازہ کھولنے چلا گیا۔ فخر نے اطمینان سے بیٹھنے کے بعد کہا۔

”مجھے سردار صاحب نے تم سے حتمی بات کرنے کے لیے بھیجا ہے۔“

”تو بولو، کیا کہتا ہے تمہارا سردار.....؟“ میں نے آہستگی سے پوچھا۔

”جو معاملہ جہاں ہے اسے وہیں ختم کر دو۔ کروڑ دو کروڑ روپیہ اس سوہنی کو دو اور قصہ ختم کر دو۔ باقی اگر تیرہ سرदार سے کچھ چاہتے ہو تو وہ بتا دو.....“ فخر و نے یوں کہا جیسے وہ اس معاملے کو ذرا بھر بھی اہمیت نہیں دینا چاہتے، ان کا خیال تھا کہ روپے پیسے سے یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ سو میں نے بڑے سکون سے کہا۔

”پہلی تو بات یہ ہے فخر وہ کہ میرا سردار سے معاملہ الگ ہے اور سوہنی کا الگ۔ ہاں ممکن ہے اس وقت ہم دونوں کا معاملہ ایک ہو جائے جب ہم دونوں شادی کریں، کیونکہ مشترکہ دشمن کے لیے دوا جی دوست بن سکتے ہیں۔“

”تم یہاں تک سوچ سکتے ہو؟“ فخر نے حیرت سے پوچھا۔

”امکانات ہیں نا، انہیں رد تو نہیں کیا جاسکتا، لیکن  
بہر حال ہم دونوں کے اب تک کے معاملات مختلف



ہیں۔ میں جو چاہتا ہوں سو چاہتا ہوں لیکن سوہنی کی تو اپنی شناخت کا معاملہ ہے۔ سردار کی بیٹی ثابت ہو جانے کا مطلب کیا ہے کہ وہ بھی اس جاگیر کی حصہ دار ہوگی؟ کون پاگل ہے جو اتنی بڑی جاگیر کا حصہ چھوڑ کر کروڑ دو کروڑ لے کر الگ ہو جائے؟ سارے ہی لوگ اس سردار کے مزارعے یا رعایا نہیں ہیں۔ عقل سمجھ رکھتے ہیں۔“ میں نے اسی سکون سے کہا۔

کیا گارنی ہے کہ مجھے وہاں قتل نہیں کیا جائے گا اس کی صرف یہی صورت ہے کہ شاہ زیب کو تمہارے حوالے کر دیا جائے تو میں حویلی چلی جاؤں گی ورنہ ایصال ثواب کی محفل ختم ہونے کا انتظار کر لے، اب اسے کہو جائے خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرے۔“ سوہنی نے تیزی سے کہا اور کمرے سے باہر نکلی چلی گئی۔ خضر کتنی ہی دیر تک میرے چہرے پر دیکھتا رہا پھر جب کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو تیزی سے اٹھ کر باہر چلا گیا اور میں اس صورت حال پر مسکرا کر رہ گیا۔ حالات نے کس طرح پلٹا کھایا تھا اب تک لوگوں کو اپنی حاکمیت کے بل بوتے پر نچانے والے میرے اشاروں پر ناز رہے تھے۔

کاؤنٹر کی طرف چل دیئے جہاں ایک خوبصورت سی لڑکی نے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سجاتی بیٹھ تھی۔ کاؤنٹر پر چند اور بھی لڑکے اور لڑکیاں تھیں، کبھی اس لڑکی نے انگریزی میں پوچھا۔

کھانے کا رڈ روینے کے بعد اس نے یو پی پوچھا۔  
 ”کمرہ آپ کو آسانی سے مل گیا نا۔ مطلب کچھ  
 ادھر ادھر کی جرح تو نہیں کی۔“



رہا ہے۔“ کیشو مہرہ کہتا چلا جا رہا تھا اور جہاں کے ساتھ ہر پریت ساس رو کے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ یوں روانی سے ساری باتیں کہتا چلا جا رہا تھا جیسے سب کچھ اس کی نگرانی میں ہوا ہو جہاں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیشو مہرہ کے ساتھ کیسا رویہ رکھے کہیں وہی اس کے گلے کا چھندانہ بن جائے۔ لیکن جسمیندر سنگھ ایسا نام تھا جس نے اسے متعارف کرایا تھا۔ اس پر تو وہ آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتا تھا۔ بھی جہاں سنگھ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہے تازہ ترین؟“

”بات پنجاب پولیس کے اعلیٰ حکام تک پہنچ چکی ہے اور وہاں پر بحث و مباحثہ بھی ہو چکا ہے۔ ان کے پاس تین آپشن ہیں پہلا کہ ان قتل کے پیچھے آئنگ واڈیوں کا ہاتھ ہے اور وہ آئنگ پھیلانا چاہتے ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ سکھوں کی خفیہ تنظیم یہ سب کچھ کر رہی ہے کیونکہ مختلف جگہوں سے یہ شاہد مل رہے ہیں کہ جھنڈارا نوالہ کی خالصتان تحریک دوبارہ فعال ہونے جارہی ہے۔ یہ آپشن زیادہ مضبوط ہے کیونکہ جھنڈارا نوالہ کے پوسٹر لگانے کی مہم کے بارے میں سنا جا رہا ہے اور تیسرا آپشن وہ ذاتی دشمنی کو دے رہے ہیں۔ اسی تیسرے آپشن میں رویندر سنگھ نے تو آپ کے خلاف واویلا مچایا لیکن اب تک کی صورت حال کے مطابق کوئی ثبوت نہ ہونے کے باعث اور آپ کی طرف سے کسی بھی قسم کے غلط رویے کے بارے میں نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ توجہ نہیں دی جارہی۔ میں چونکہ تین دن پہلے تھائی لینڈ سے آیا ہوں اور جسمیندر نے مجھے وہاں تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا اس.....“ اس نے کہنا چاہا لیکن جہاں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”یہ پولیس والی بات جسمیندر نے بتائی ہے؟“

”نہیں..... نہیں..... اس نے نہیں..... اس نے“

تو مجھے تمام پس منظر بتانے کے ساتھ اب تک کی صورت حال بتائی ہے۔ آگے کیا کرنا ہے اس بارے میں بھی کچھ خدوخال ہیں میرے پاس یہ پولیس والی ساری رپورٹ تو میں نے آ کر لی ہے نہ اب تک پولیس کے پاس تمہارے لیے کوئی بھی منفی پوائنٹ نہیں ہے بلکہ پلس پوائنٹ ہیں کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوا تمہیں خواہ مخواہ اوگی تک محدود رکھا جا رہا ہے۔ بلایت سنگھ نے حویلی کو دوبارہ بنانے پر رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی اور یہ زور دیا جا رہا ہے کہ تم ہی اس ساری صورت حال کی وجہ ہو جبکہ ثبوت کوئی نہیں۔“

”یہ بات تو ہوگئی مہرہ صاحب! سکھ تنظیم کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟“ ہر پریت نے اچھتے ہوئے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

”وہی لوگوں کی کیفیت ہے اگر انہیں ذرا سا بھی اشارہ مل جائے تو وہ ساری توجہ اس طرف نہ لگا دیں۔ آپ دیکھو اب تک ایک بھی گرفتاری نہیں ہوئی خیر.....! اب میں آپ کو شورشید دینا چاہ رہا ہوں کہ آپ اپنی ساری توجہ صرف اور صرف اپنی جائیداد کے حصول کی طرف لگا دیں، رویندر سنگھ اس راہ میں روڑے اٹکائے گا یہی تمہاری بے گناہی بنے گی۔ کیونکہ دشمنی ان کی طرف سے ہوگی تمہاری طرف سے نہیں۔ اوگی پنڈ میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائیں لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کریں۔ مطلب دفاعی پوزیشن میں آ جائیں۔ ہو سکے تو بلایت سنگھ کے سیاسی حریف کو اپنے قریب کریں اسے معاشی مدد دیں وغیرہ وغیرہ۔“

”اس طرح تو میرا مقصد بہت دور تک بلکہ میری رسائی سے بھی آگے تک نکل جائے گا۔ بہت صبر کرنا پڑے گا۔“ جہاں نے یوں کہا جیسے وہ ناکام ہو رہا ہو۔

”دیکھو..... ایک راستہ ہے قتل و غارت گردی کا۔ اس میں پولیس سے لے کر خفیہ ایجنسیاں تک آپ کے پیچھے لگ جائیں گی۔ پھر فرار کا راستہ نہیں ہوگا آپ کے پاس۔ یہ طے نہیں کہ آپ اپنا کام مکمل بھی کر لو گے یا نہیں۔ لیکن دوسرا راستہ طویل تو ہے لیکن سو فیصد امکان ہے کہ آپ رویندر سنگھ کے خاندان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا مقصد نہیں ختم کرنا ہے۔“

مہرہ نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو جہاں نے اچانک ہی ایک سوال کیا۔

”آپ اس سارے معاملے میں دلچسپی صرف جسمیندر کے کہنے پر لے رہے ہیں یا.....“

”میرا ذاتی مقصد بھی ہے لیکن یہ کہانی پھر کبھی وقت سہی اب تو ہم ملتے ملتاتے رہیں گے لیکن قانونی مشیر کے طور پر اس کے علاوہ ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایڈووکیٹ گل بلاشبہ سنئیر وکیل ہیں۔ بہت سمجھدار ہیں وہ جائیداد کا معاملہ حل بھی کر لیں گے لیکن خفیہ والے ان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سکھ تنظیم کے بڑے سرگرم رکن ہیں۔ اس وجہ سے بھی وہ آپ کی راہ میں رکاوٹ آ جاتی تھی۔ اب بھی اور اس وقت بھی آپ کی نگرانی ہو رہی ہے گردن موڑ کر مت دیکھنا لیکن ہمارے دائیں طرف جو جوڑا بیٹھا ہے وہ خفیہ والوں کا ہے یہ ڈرامہ خود چلایا ہے ورنہ میں آپ سے اوگی میں آ کر بات کر سکتا تھا میرے چیمبر یا گھر میں بات ہو سکتی تھی۔“

”مطلب“ انہیں اپنا آپ دکھایا جائے کہ ہم نہایت شریف آدمی ہیں۔“ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بالکل! آپ کا یہاں ہونا صرف تفریح اور میرے ساتھ لوگوں کے ساتھ ملنا ملنا ہے۔ کمرے میں بھی ایسی کوئی بات نہیں کرنا ممکن ہے کوئی خفیہ کیمرہ یا مائیک“

لگا ہو مطلب آپ جس قدر بہتر انداز میں ان تک اپنا پیغام پہنچا سکیں ہو سکتا ہے یہی جوڑا آپ کے نزدیک ہونے کی کوشش کرے یا کوئی نیا آجائے۔“ مہرہ نے مسکراتے ہوئے یوں کہا جیسے بہت دلچسپ بات بتا رہا ہو۔ اتنے میں بے را کھانا لگانا لگا۔

”اچھا آپ آنے والے دنوں میں خدوخال کی بات کر رہے تھے۔“ ہر پریت نے پوچھا تو مہرہ ہنس دیا اور پھر بولا۔

”اسمارٹ گرل..... میں مانتا ہوں کہ تم بہت بہادر اور ذہین ہو لیکن ابھی یہ مرحلہ طے ہو جانے دو ابھی ہم دونوں یہاں ہیں بہت ساری باتیں ہوں گی فی الحال تو ہمیں کھانے پر توجہ دینی چاہیے۔“

کھانے کے دوران وہ یہاں کے عدالتی نظام جائیداد کے امور کے بارے میں باتیں جالندھر میں اپنے اثر و رسوخ اور ایسی ہی بہت ساری باتیں کرتا رہا۔ ان کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ یونہی گپ شپ میں کھانا ختم ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد کیشو مہرہ اٹھ کر چلا گیا۔ وہ اس کے ساتھ ڈائننگ ہال سے باہر تک آئے۔ اس دوران اس جوڑے کو انہوں نے غور سے دیکھا۔

”لو جی! پھر صبح آپ نے میرے پاس آ جانا ہے اور آنے سے پہلے مجھے فون کر دینا ہے ابھی میں کسی عدالت میں پیش نہیں ہو رہا اور یہ دونوں آپ کے لیے ہیں۔“ اس نے پہلے جہاں سے ہاتھ ملایا اور پھر ہر پریت سے ہاتھ ملا کر خوش دلی سے بولا۔ ”اور تمہارا سوال مجھ پر ادا کر رہا۔“

”میں منتظر ہوں گی۔“ اس نے کہا تو وہ پارکنگ کی جانب بڑھ گیا۔ اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ کمروں کی رو کی دوسری جانب ایک بڑا سارا لان تھا سبز لان جس کے کناروں پر پھول اگے ہوئے



تھے۔ اس میں ہند کی نفیس کرسیاں بڑی ہوئی تھیں۔ دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ وہاں ایک دوسرے سے دور دور جوڑے بیٹھے ہوئے باتوں میں مصروف تھے۔ وہ بھی ایک سنان سے گوشے میں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”چائے پیئیں یا سوڈا.....“ ہسپال نے بیٹھے ہی پوچھا۔

”فی الحال تو چائے پیتے ہیں۔ نیند تو آئے گی نہیں ابھی باتیں کرتے ہیں۔“ ہر پریت بولی۔ اس کے لہجے میں نجانے کیوں یاس ٹیک رہی تھی۔ جس پر ہسپال نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”خیر تو بے تم یکدم اداس ہوگئی ہو؟“

”نہیں“ میں اداس نہیں ہوں۔“ وہ پھر اسی لہجے میں ہی بولی۔

”نہیں مہرہ کی بات کا برا تو نہیں منایا تم نے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں“ اس نے سر ہلاتے ہوئے دکھ سے کہا۔

”تو پھر یہ تمہارا لہجہ.....؟“ ہسپال نے تشویش سے پوچھا۔

”ہسپال! دیکھو ہم بحیثیت سکھ قوم اس ملک میں غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں جس کے لیے ہمارے بڑوں نے قربانیاں دیں۔ اس ملک میں ہمارا تاریخی قتل ہوا جس کی آزادی کے لیے ہم نے جنگ لڑی..... اب یہاں ہم محکوم کی زندگی گزار رہے ہیں کیا ہے ہماری قوم کا مستقبل؟“

”میں بتاؤں..... اصل میں کسی بھی حریت پسند قوم کو ختم کرنا ہوتا تو اس میں حریت جیسے جذبے کو مار دیا جاتا ہے۔ اس کے دوطرے تھے جس میں میری جان ایک تو اسے لذت پرستی پر لگا دو جیسے آج کل سکھ قوم کے نوجوان سب سے زیادہ شراب پیتے ہیں عورت استعمال کرتے ہیں گندے سے گندہ گانا سنتے

ہیں بلکہ کبھی ناچ گانے کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ پنجاب دنیا بھر میں وہ خطہ ہے جہاں سب سے زیادہ شراب پی جاتی ہے۔“ میرا نہیں اتوارم متحدہ کے اداروں کا سروے ہے۔ سکھ قوم شراب میں ڈوبیا جا رہا ہے پوری پلاننگ کے ساتھ۔ ہر گاؤں میں شراب بیچنے والی دکان ہے کیوں نہیں ختم کرتے..... اور دوسرا طریقہ ان پر خوف مسلط کر دو انہیں ذلیل کرو اتنا ذلیل کرو کہ ان میں حریت کی خوبی نہ رہے۔ یہ سب کچھ سکھوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور سکھ ہی اپنی جاہلیت کی بنا پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔“ ہسپال بھی اچانک ہی جذباتی ہو گیا۔

”تو پھر پٹے ہو ہسپال..... اوگی میں ہم لوگوں کے پاس جائیں گے اور اس بارے میں ہم چلائیں گے۔ انہیں اس کا شعور دیں گے۔“ ہر پریت نے ہسپال کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”جذباتی انداز میں فیصلہ کر لینا بہت آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے پریتو..... لیکن ہم ایسا کچھ کریں گے کم از کم اپنی حد تک ضرور کچھ کریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے طویل سانس لیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے چائے کا پوچھا تھا۔“

”چلو چل کر کمرے میں پیئیں۔ اگر یہاں رومانوی جوڑا بن کر رہنا ہے تو ویسا ہی رہیں۔ ایویں خواہ مخواہ خود پر ڈپریشن طاری کیا ہوا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ہر پریت زبردستی مسکرا دی۔

وہ دونوں اٹھ کر چہل قدمی کے لیے انداز میں اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ بھی ہر پریت نے کہا۔

”جی..... کیا تمہیں اس کیشیو مہرہ پر یقین ہے۔ کیا یہ سب کچھ ٹھیک کہتا تھا؟“

”مجھے اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں پریتو میرے لیے تو وہ جمیندر سنگھ تھا۔ سمجھ لو کہ اس نے اپنا سایہ دو بدو ملاقات کے لیے یہاں بھیج دیا اور میں جانتا ہوں کہ اس کے بدلے اس نے مہرہ کو جانے کتنا بڑا فائدہ دیا ہوگا جو یہ ہمارے پاس یہاں تھا۔ باقی دیکھتے ہیں وہ دودن میں کیا کرتا ہے۔“ ہسپال نے چابی دروازے میں لگاتے ہوئے کہا پھر اندر داخل ہوتے ہی روشنی ہوگئی۔ انہوں نے دروازہ اندر سے لاگ کر لیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک بیڈ پر آ لیے۔ دونوں ہی ہلکے پھلکے لباس میں تھے۔ دھیمی روشنی میں ہر پریت کا ساتھ۔ ہسپال کو وہ ماحول بہت اچھا لگ رہا تھا۔ قربت کا اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے۔ وہ دونوں کٹنی ہی دیر تک ایک دوسرے کو کتکتے رہے۔ بھی ہر پریت نے کہا۔

”جی.....! بھی تم نے سوچا تھا کہ تم پنجاب آؤ گے اور میرے جیسی سر پھری لڑکی سے ملاقات ہوگی اور یوں ہم ایک ہی بیڈ پر اتنے قریب ہوں گے۔“

”میں نے سوچا تو نہیں تھا سچی بات تو یہ ہے لیکن میرے لاشعور میں کہیں تھا کہ اگر مجھے کوئی لڑکی پسند آئی تو وہ پنجاب ہی سے ہوگی کیونکہ پھوپھو سکھ جیت کور نے ہمیشہ پنجاب کی لڑکی کا ایک خاکہ میرے ذہن میں ابھارا تھا جو مجھے بہت اچھا لگتا تھا تم بالکل ویسی ہو بس کبھی کبھی اچھی نہیں لگتی.....“

ہسپال نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

”وہ کیوں؟“ وہ چپک کر بولی۔

”جب تم یہ جین اور شرٹ پہنتی ہو اور یورپین کی طرح لگتی ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا یہ بری بات ہے نہ پہنوں؟“ اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہے۔ چیخ رہتا ہے لیکن سچی بات ہے تم شلوار قمیص میں بہت پرکشش لگتی ہو۔“ وہ اس کے بالوں سے کھیلتا ہوا کہنے لگا۔ ”اس کے علاوہ تمہاری باتیں بہت اچھی ہیں جس میں خلوص ہوتا ہے ورنہ وینکوروں میں جس لڑکی سے بھی بات کر لو اس کی ہر بات میں کہیں نہ کہیں کوئی مقصد یا لالچ ہوتا ہے۔“

”کیا وہ سب ایسی ہیں؟“

”اس میں ان کا قصور نہیں ہے وہاں ماحول ہے نا ایک مادی معاشرہ ہے جہاں صرف اپنی ذات کے متعلق ہی سوچا جاتا ہے۔“ اس نے کہا تو ہر پریت وینکوروں کی باتیں کرنے لگی اپنی باتوں میں وہ کم ہو کر کب سو گئے انہیں احساس ہی نہیں رہا۔

صبح وقت پر تیار ہو گئے ہر پریت نے موتیا رنگ کا شلوار قمیص پہن لیا تھا اور ہلکا ہلکا میک اپ کر لیا۔

ہسپال بھی تیار ہو گیا۔ انہوں نے ناشتہ وہیں کمرے میں منگوایا۔ تقریباً دس بجے انہوں نے کیشیو مہرہ کو فون کیا تو اس نے انہیں گیتا کالونی کے پاس ایک چوک تک آنے کا کہا تاکہ پھر وہ اکٹھے ہی آگے نکل جائیں۔ جس وقت وہ دونوں لابی سے گزر رہے تھے انہیں وہ رات والا جوڑا وہیں بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ اگر مہرہ نے ان کی نشاندہی نہ کی ہوگی تو شاید وہ اسے اتفاق سمجھ کر نظر انداز کر چکے ہوتے۔ دونوں نے اپنا کوئی رسپانس نہ دیا اور چلتے ہوئے پارکنگ میں جا پہنچے۔

”پریتو.....! ان دونوں کے علاوہ ہم میں کوئی دلچسپی لے رہا ہے۔“ یہ دیکھو۔

”مجھے احساس تو نہیں ہوا ابھی میں پہلے ہی دیکھ رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”اچھا..... ڈرائیوگ تم کرنا مجھے راستوں کا علم نہیں ہے۔“ ہسپال نے کہا تو ہر پریت نے چابی

دے دی۔

نئے افق 185 اگست 2013 عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نئے افق 184 اگست 2013 عید مبارک عید مبارک عید مبارک



## خليل جبار

خواہشات کا گھوڑا اگر بے لگام ہو جائے تو انسان کا اپنے نفس، سوچ اور ارادے پر کوئی کنٹرول نہیں رہتا اور وہ اچھے برے کی تمیز کھو کر تباہی کے گہرے گڑھے میں خوشی سے کود جاتا ہے۔

معروف صحافی خلیل جبار کی ڈائری کا ایک ورق، قتل کی ہولناک واردات کا احوال، جس کے کردار آج بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے وقت گزار رہے ہیں۔

بس مسافروں سے کچھا بچ ہوئی تھی مگر کنڈیکٹر کا پیٹ نہیں بھرا تھا اس کی کوشش تھی کہ مزید مسافروں کو بس میں ٹھوس دے مئی کا مہینہ شروع ہوتا ہی گرمی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ گرمی سے مسافروں کا برا حال تھا صبح کے وقت کام پر جانے والوں کو بہت جلدی ہوتی ہے اس لیے وہ کسی دوسری بس کا انتظار کرنے کی بجائے آتی ہوئی بس میں چڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کنول کو بھی روزانہ اسکول جانا ہوتا تھا اس لیے وہ گھر سے وقت سے پہلے ہی نکلتی تھی تاکہ اسکول پہنچنے میں دیر نہ ہو۔ رانیوئٹ اسکولوں میں استادوں کے وقت پر آنے اور جانے پر مالکان کی بڑی گہری نظر ہوتی ہے وہ دیر سے جانے پر کچھ نہیں کہتے لیکن دیر سے آنے کا ضرور نوٹس لیتے ہیں۔

کنول کو اسکول میں پڑھاتے دو سال کا عرصہ بیت گیا تھا، وہ اپنی ڈیوٹی بڑی فرض شناسی سے نبھاتا تھا، لیکن اس پر اس کے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ گھر کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھتی اس کے والدین کی بڑی خواہش تھی کہ اس کا کوئی اچھا رشتہ آجائے تاکہ وہ اس کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں لیکن غریب گھرانوں میں اتنی آسانی سے رشتے کہاں آتے ہیں یہی کنول کے ساتھ بھی تھا، والدین جتنی جلدی اس کی شادی کرنا

پکڑی اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔ دونوں نے غیر محسوس انداز میں ارد گرد کا جائزہ لیا۔ انہیں کوئی دکھائی

”یہاں میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ اس گیتا کا لونگی میں ایک شخص رہتا ہے جو یہاں کے محکمہ مال کے ایک بڑے آفیسر کا سارا معاملہ دیکھتا ہے۔ جب تو وہ فکرمک کی کرتا ہے لیکن بہت پیچھی ہوئی چیز ہے۔ میری اس سے ابتدائی ملاقات تو ہو گئی تھی۔ اب آپ لوگوں سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔“

”پرتیو.....! ہمارا تعاقب شروع ہو گیا ہے۔ اب دھیان سے۔“ جیپال نے بتیتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔  
 ”میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی کہ ہم ان کی نگاہوں سے کہیں اوجھل ہی نہ ہو جائیں۔“  
 ”نہیں! اس کی نظری میں رہیں گے، جو ہمیں اپنی ”اس ملاقات کا مقصد؟“۔ جیپال نے پوچھا۔  
 ”یہ طے کرنا ہے کہ آپ اسے کتنی دو گے مطلب ڈیل ہوگی۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ بھی جیپال نے دیکھا کہ ہر پریت بھی کار سے نکل کر ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔

نگاہ میں رکھنا چاہتا ہے۔“ جہاں نے کہا تو ہر پریت نے رفتار بڑھادی۔ درمیان میں مہرہ کا فون بھی آیا تو اس نے تعاقب کے بارے میں بتا کر موجودہ پوزیشن کے بارے میں بتایا۔ کچھ دیر بعد وہ گیتا کالونی کے اس چوک میں پہنچ گئے جہاں مہرہ نے انہیں بلوایا تھا۔ فون پر رابطہ کے بعد وہ کالونی کے پاس مل گئے۔ صبح کے وقت لوگوں کے دفتر جانے کا ریش بہت

”ٹھیک ہے، جیسا آپ چاہو بات تو آپ ہی نے کرتی ہے۔“ یہ لفظ ابھی جہاں کے منہ ہی میں تھے کہ اس نے ہر پریت کی پشت پر موٹر سائیکل پر سوار دونو جوانوں کو دیکھا، پیچھے پیٹھے ہوئے نو جوان نے گن ان کی طرف سپر سٹی کر لی تھی۔ جہاں کے دماغ میں گھنٹیاں بج گئیں۔ اس نے چیخ کر ہر پریت کو پکارا۔

حد تک لم ہو گیا تھا۔ ٹریفک اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن پھر بھی لوگ اپنے اپنے معاملات اور زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کے باعث سڑک پر آ جا رہے تھے۔ کافی ٹھہراؤ سا تھا۔ مہرہ سڑک کی دوسری جانب کالونی کے گیٹ کی طرف تھا، جبکہ انہوں نے آگے کے یوٹرن سے مڑ کر واپس آنا تھا۔ ہر پریت بڑی احتیاط سے گاڑی موڑ کر چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔ مہرہ گاڑی سے باہر نکل کر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ہر پریت نے بھی گاڑی ان کے قریب جا کر روک دی۔ جہاں پہلے نکل کر مہرہ کی جانب بڑھ گیا۔ دونوں نے گرم



ہوتی ہے کوئی گڑبضرور ہے اس نے سوچا۔ سوچوں میں گم کنول کا اسباب نے پروہ بس سے اتر گئی۔

اسکول میں بھی کئی بار اس کا ذہن اس نوجوان کی طرف جارہا تھا وہ بہت خوب صورت نوجوان تھا وہ بنا سوچے نوجوان کے متعلق ہی سوچتی رہی چھٹی ہو جانے پر وہ اسکول سے نکلی اور بس اسباب پر پہنچ گئی۔ وہ نوجوان اسباب پر پہلے سے موجود تھا۔ کنول کو اسے دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا مگر وہ انجان سی بنی کھڑی ہو گئی۔ وہ نوجوان اسباب پر کھڑے اسے ہی دیکھ رہا تھا وہ نوجوان کی طرف دیکھ کر اسے کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی بس آنے پر وہ بس میں سوار ہو گئی۔

دوسرے تیسرے دن بھی ایسا ہی اتفاق ہوا کہ وہ اس کے ساتھ ہی بس میں سوار ہو کر آتا اور ساتھ ہی بس میں گھر جانے کو روانہ ہوتا پھر روزانہ ایسا ہی ہونے لگا وہ سوچ میں پڑ گئی یہ اتفاق ہرگز نہیں ہو سکتا وہ ضرور جان بوجھ کر اسی بس میں سوار ہوتا ہے جس میں وہ سوار ہوتی ہے لیکن وہ ایسا کیوں کر رہا ہے کیا اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے نہیں آج کل نوجوان کسی سے کیا محبت کریں گے یہ اپنا فالتو وقت لڑکیوں سے فلرٹ کرنے میں بتا دیتے ہیں۔ یہ محبت سے نا آشنا کیا جانیں کہ محبت کیا جذبہ ہوتا ہے اس جذبے کی قدر کرنا کیسا گھٹا جیسے تو پھر کسی لڑکی کے ساتھ دھوکہ نہ کریں۔

ایک روز اسے اسکول کے کام سے اپنی بیٹی عظمیٰ کے اسکول جانا پڑا۔ عظمیٰ سے مل کر وہ جیسے ہی باہر جاری تھی کہ بے اختیار اس کی نظر ایک کلاس پر پڑی اسے حیرت کا جھٹکا لگا کلاس میں بچوں کو وہی نوجوان پڑھا رہا تھا۔

”ارے یہ نوجوان ٹیچر ہے جی بس میں اس کے آنے کا وہی وقت ہے جو میرا ہے۔“ اس نے خود کلامی کی اور آگے بڑھ گئی نوجوان نے بھی کنول کو

دیکھ لیا تھا مگر وہ یوں انجان بن گیا جیسے اس نے کنول کو دیکھا ہی نہیں ہے۔

عظمیٰ سے اسے ملے دو ہی دن ہوئے تھے کہ عظمیٰ اس سے ملنے گھر آ گئی اسے دیکھ کر کنول کو خوشی ہوئی اور حیرت بھی۔ عظمیٰ بہت مصروف لڑکی تھی اسکول، شام میں ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی۔ اس لیے کنول سے اس کی ملاقاتیں بہت کم ہوا کرتی تھیں۔ بڑھاتے ہوئے اسے جب کوئی پریشانی ہوتی تھی وہ عظمیٰ کے اسکول جا کر ملاقات کرتی تھی وہ کنول کی الجھن کو منٹوں میں سلجھا دیتی تھی۔ آج عظمیٰ کے گھر آنے پر اس لیے اسے حیرانی ہو رہی تھی۔

”کنول تم بڑی چھپی رستم نکلی۔“ تنہائی ملنے پر وہ بولی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ کنول چوکی۔

”محبت کی پٹیلیں بڑھانی جا رہی ہیں اور مجھ سے بھولی بن کر پوچھ رہی ہو کیا ہوا؟“ عظمیٰ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ کنول نے کہا۔

”اچھا تم مجھ سے بھی جھوٹ بولنے لگی ہو کیا تم فہم سے محبت نہیں کرتیں؟“ عظمیٰ نے کنول کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”فہم! یہ کون صاحب ہیں؟“ کنول ابھی تک حیرت زدہ تھی۔

”وہی فہم جو ہمارے اسکول میں پڑھاتا ہے۔“

”اچھا! اچھا ان صاحب کا نام فہم ہے۔“ کنول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بیجا میری طرف دیکھتا رہتا ہے پہلے میں سمجھتی تھی کہ اتفاق ہے لیکن پھر پتا چلا کہ وہ بھی میرے اسکول میں ٹیچر ہے اس لیے ہمارا اسکول جانے کا ایک ہی دہانے ہوئے پریس میں ایک ساتھ جانا ہو رہا ہے۔

”اس کا مطلب ہے عشق یک طرفہ ہے۔“

”لیکن یہ بات تمہیں کس طرح معلوم ہوئی؟“ کنول نے پوچھا۔

”مجھے فہم سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ تم دونوں محبت کرتے ہو اور شادی کرنا چاہتے ہو۔ مجھے رشتہ کی بات بڑھانے کو اس نے یہاں بھیجا ہے مگر میں نے ضروری سمجھا کہ پہلے تم سے بات کروں پھر رشتے کی بات آگے بڑھانی جائے۔“

”عظمیٰ! کیا وہ تمہارا رشتہ دار ہے۔“

”نہیں اسکول میں ہی اس سے ملاقات ہوئی تھی جس دن تم مجھ سے ملاقات کر کے گئی ہو اس وقت وہ میرے پاس آیا اور تمہارے بارے میں پوچھا۔

میرے بتانے پر اس نے کہا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے پھر میں اب کیا تمہارے والدین سے بات کروں؟“

”تم کچھ بات نہ کرو اس طرح کوئی رشتہ ہوتے ہیں رشتہ داری کرنے کے لیے اس کے گھر والوں کو آنا چاہیے۔“

”یہ باتیں والدین کرتے ہی اچھے لگتے ہیں اگر اس کے والدین زندہ ہوتے تو وہی رشتے کی بات کرنے آتے۔“

”کیا وہ اکیلا ہے؟“

”ہاں! وہ اپنے فلیٹ میں اکیلا ہی رہتا ہے تمہارے لیے گولڈن چانس ہے گھر میں جھگڑا کرنے والا کوئی بھی نہیں ہوگا۔ رشتہ داروں میں بھی وہ بہت کم لگ جاتا ہے۔“

”مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں! تم ضرور سوچ لو اسے بھی زیادہ جلدی نہیں ہے۔“ عظمیٰ نے کہا۔

وہ عظمیٰ کے چلے جانے پر سوچ میں پڑ گئی کہ اس موقع پر وہ کیا کرے۔ فہم ایک خوب صورت نوجوان تھا کسی بھی لڑکی کے لیے آئیڈیل ہو سکتا تھا شادی ہو جانے پر وہ اس کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار سکتی تھی۔ ساس نندوں کے جھگڑوں سے آزاد ہوتی۔

کنول کا خیال تھا کہ اس کے والدین اس رشتے کے لیے تیار نہ ہوں گے جس طرح وہ رشتے کے لیے تیار ہو گئے تھے اس سے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے ہی ذہن بنائے بیٹھے تھے کہ جیسے ہی کوئی رشتہ آئے گا وہ جھٹ پٹ اس کا بیاہ کر دیں گے۔ ایک ماہ کے اندر اندر کنول کی فہم سے شادی ہو گئی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ والدین پر ایک بوجھ بھی جو انہوں نے اس طرح سے اتار دیا تھا۔

شروع کے چند ماہ اس کے بہت اچھے گزرے۔ مہنگائی کے اس دور میں ان دونوں کو کام کرنا پڑ رہا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ اسکول جاتے پھر ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے رات گئے وہ اتنے تھک جاتے تھے کہ بستر پر بڑے ہی انہیں نیند آ جاتی تھی آہستہ آہستہ فہم کی ٹیوشن ختم ہوتی چلی گئی یہی کچھ کنول کے ساتھ بھی ہونے لگا تھا۔ اسکول کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ ان کا گزارا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ گھر کے اخراجات میں کمی کی جانے لگی تھی کہ تنخواہ کو پورے مہینہ چلایا جاسکے۔ ان کی زندگی ان ہی مشکلات میں گزر رہی تھی کہ فہم کو اسکول سے فارغ کر دیا گیا۔ اس نے کئی جگہ نوکری کے لیے کوشش بھی کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پریشانیوں نے ان کا ہی گھر دیکھ لیا ہے۔ روزگار نہ ہونے سے فہم چڑچڑاسا ہو گیا تھا۔ بات بات پر کنول

”ہاں! وہ اپنے فلیٹ میں اکیلا ہی رہتا ہے تمہارے لیے گولڈن چانس ہے گھر میں جھگڑا کرنے والا کوئی بھی نہیں ہوگا۔ رشتہ داروں میں بھی وہ بہت کم لگ جاتا ہے۔“

”کیا وہ اکیلا ہے؟“

”ہاں! وہ اپنے فلیٹ میں اکیلا ہی رہتا ہے تمہارے لیے گولڈن چانس ہے گھر میں جھگڑا کرنے والا کوئی بھی نہیں ہوگا۔ رشتہ داروں میں بھی وہ بہت کم لگ جاتا ہے۔“











بڑھا کر دے رہی ہوں اس لیے اپنی اوقات میں رہو زیادہ مرد بننے کی کوشش مت کرو ورنہ پھر خرچہ ملنا بند۔“ کنول نے دھمکی دی۔

”نہیں..... نہیں ایسا غضب نہ کرنا۔“

”پھر میں جیسے کہوں ویسے ہی چلتے رہو۔“ کنول نے کہا۔

فہیم پر خرچہ بند ہونے کی دھمکی کا گر ثابت ہوئی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گیا۔

رات جب کنول بستر پر سونے کے لیے بیڈ پر گئی اس کا ذہن اس وقت فہیم کے متعلق ہی سوچ رہا تھا وہ اس کے لیے کاٹنا جاتا رہا تھا آئے دن خرچہ بڑھانے کو اسے بلیک میل کرنے لگا تھا۔ اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا تھا جس کے باعث اچھی خاصی رقم بھی اسے کم لگنے لگی تھی۔ نیندا آنے سے پہلے وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اسے دلدار خان کی ضرورت تھی۔ فہیم اس کی راہ سے نکلنے پر ایک مضبوط سہارا دلدار خان کی صورت میں مل سکتا تھا۔

دوسرے دن جب دلدار خان آیا کنول نے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو دلدار خان چونک گیا۔

”یہ کیسے ہوگا، پولیس مجھے قتل کے الزام میں پکڑ لے گی۔“

”تمہارا نام قتل میں نہیں آئے گا میں کہہ دوں گی گھر میں ڈکیت گھس آئے تھے وہ قتل کر کے چلے گئے پھر جب بات دب جائے گی ہم شادی کر لیں گے پھر ہمارے ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔“ کنول نے کہا۔

”ہاں وہ تمہارا بات ٹھیک ہے لیکن پولیس.....“

”پولیس کو سمجھانا میرا مسئلہ ہے تم یہ بتاؤ کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”ہاں میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن جب

تک فہیم زندہ ہے یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔“

”اسے راستے سے ہٹانا ہی ہوگا جیسی یہ ممکن ہو سکتا ہے۔“ کنول نے کہا۔

”ٹھیک ہے مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا ہے۔“

”تم گھر میں ہی چھپ جانا جب فہیم آ کر سو جائے تم اسے خنجر سے ہلاک کر دینا۔“ کنول نے ایک تیز دھار خنجر دلدار خان کو دکھایا دلدار خان نے خنجر دیکھ کر ہامی بھری۔

منصوبے کے مطابق تیسرے روز دلدار خان کنول کے گھر میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ فہیم رات گئے گھر لوٹا اور آتے ہی بستر پر پڑ کر سو گیا۔ اس کے سو جانے پر دلدار خان چنان سے نیچے اتر آیا دونوں نے مل کر فہیم کے ہاتھ پاؤں باندھنا شروع کر دیا وہ بیدار ہو گیا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی جیسے ہی شور مچانا چاہا دلدار خان نے رومال اس کے منہ میں ٹھوس دیا۔ فہیم اپنے بچاؤ کے لیے بالکل بے بس ہو گیا تھا دلدار نے ذرا بھی تاخیر نہیں کی اور خنجر فہیم کے دل میں اتار دیا۔ فہیم پٹی پٹی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں حیرت تھی وہ کچھ دیر تک تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

”دلدار خان ہمیں اب دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ چند ماہ ہمیں صبر کرنا ہوگا پھر ہم شادی کر لیں گے۔ اس دوران تم مجھ سے موبائل پر رابطہ رکھو گے۔“ کنول نے کہا۔

”ٹھ..... ٹھ..... ٹھیک ہے۔“ دلدار خان جوش میں آ کر فہیم کا قتل کر بیٹھا تھا لیکن اب خوف سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور وہ سخت گھبراہٹ کا شکار تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے پھر ناجانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ دروازہ کھول کر فلیٹ سے باہر بھاگ گیا۔ اس کے بھاگنے پر جیسے کنول کو کچھ ہوش آ گیا تھا

.....☆☆☆.....

اس نے پھرتی سے فہیم کے منہ سے رومال نکالا ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر منصوبے کے مطابق اس نے شور مچانا شروع کر دیا اس کا شور سن کر آس پاس کے فلیٹوں سے لوگ باہر نکل آئے اور کنول کے فلیٹ میں گھس آئے کنول بین کرتے ہوئے اپنے بالوں کو پکڑ پکڑ کر دھاڑیں مار رہی تھیں۔

”ہائے ڈاکو میرے شوہر کو مار کر چلے گئے وہ میرا پورا گھر خالی کر دیتے لیکن میرے سہاگ کو تو نہ مارتے۔ میرا اور میری بچیوں کا کیا بنے گا۔“

شور سن کر کنول کی دونوں بینیاں بھی سوتے سے اٹھ گئی تھیں اور حیرت سے اپنے باپ کی لاش دیکھ رہی تھیں اور پھر اپنی ماں کو روٹا دیکھ کر وہ بھی کنول سے لپٹ کر رونے لگیں۔ پولیس بھی اطلاع ملنے پر پہنچ گئی اور اپنی ضروری کارروائی مکمل کر کے فہیم کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی۔

گرمی کی شدت بہت تیز تھی گرمی سے میرا برا حال تھا میں اس وقت ہائی کورٹ سے سیشن کورٹ آیا تھا۔ میں کچھ ریلیکس ہونے کی غرض سے جیسے ہی کینٹین میں داخل ہوا مجھے سماجی رہنما عبدالحمید منہری والا بیٹھا ہوا نظر آیا اس کے پہلو میں محمد قاسم عرف کھائی بیٹھا ہے جینی سے بار بار پہلو بدلتا نظر آیا۔

”خیریت ہے نا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہاں ہاں خیریت ہی ہے تم کئی دن سے پھیلپا پار نہیں آئے تھے اور یہ کھانسی میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ تم سے ملاقات کرانی جائے اس لیے میں اسے کورٹ لے آیا ہوں۔“

”ہاں مجھے کھانسی مجھ سے کوئی کام وغیرہ تو نہیں ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”تم سے بہت ضروری کام ہے جیسی آیا ہوں۔“

”اچھا۔“ میں چونکا۔

”ذخیل جبار یہ اچھی بات نہیں ہے تم استاد پیارے کو چھوڑ کر اپنے مہمانوں کے پاس بیٹھ گئے ہو۔ ایک کونے سے استاد پیارے کی آواز آئی۔ کینٹین میں داخل ہوتے ہوئے میری اس پر نظر پڑی تھی ویسے بھی اس نے سگریٹ کا دھواں اپنے ارد گرد چھوڑا ہوا تھا کہ غور سے دیکھنے پر ہی اس کی شکل نظر آئی۔

”آپ بھی آجائیں۔“ میں نے کہا۔

میرے یہ کہنے پر استاد پیارے کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آ گئی تھی۔ ایسی چمک اس وقت ان کی آنکھوں میں آتی تھی جب انہیں ”پیدا“ کا آسرا نظر آ جاتا تھا۔ وہ عبدالحمید منہری والا کو بھی ایسا ہی شکار محسوس کر رہے تھے وہ مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آئے۔

”ذخیل جبار تم کہاں چلے گئے تھے یہ تمہارے مہمان بہت دیر سے کینٹین میں بیٹھے ہوئے ہیں مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں ورنہ میں ان کو اتنی دیر بور بیٹھنے نہیں دیتا۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”اور کھانسی سناؤ کیا حال ہیں؟“ میں نے قاسم کو مخاطب کیا۔

”کھانسی یہ کیسا نام ہے؟“ استاد پیارے چونکے۔

”دراصل اپنے علاقے ساگر کالونی میں یہ کھانسی کے نام سے مشہور ہیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”کیا انہیں کھانسی کی کوئی پرابلم تو نہیں تم فکر نہ کرو استاد پیارے موجود ہیں تو فکر کی کوئی بات نہیں میں سول اسپتال میں بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے تمہارا علاج مفت میں کرا دوں گا۔“ استاد پیارے نے پیش کش کی۔

”استاد پیارے ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا اچھا پھر بھی کوئی بھی مسئلہ ہو استاد پیارے موجود ہے۔“

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک عید مبارک



”میں کہہ رہا تھا کہ سیمنٹ کے چیئرمین کے ایشن کھانی نے کہا۔

”میں کچھ سمجھا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں اسی کی بات کر رہا ہوں پہلے بھی میں نے  
 تمہیں بہت ڈھونڈا تھا وزیراعظم کی سیٹ خالی ہوئی تھی  
 مگر تم سے ملاقات نہ ہو سکی اس بار تم ضرور صدر صاحب  
 کو فون کر کے مجھے سینٹ کا چیئرمین، غداؤ ایمان سے  
 میں چیئرمین بن کر چھیلی پاراور سا گرگالونی کی ساری  
 نالیاں صاف کرادوں گا“ کچرے کے ڈھیر بھی کہیں نظر  
 نہیں آئیں گے۔“ قاسم عرف کھانی نے کہا۔

”قاسم کھالسی ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ خلیل جبار تمہیں سینیٹ کا چیئر مین کیسے بنوادے گا۔“ استاد پیارے نے پوچھا۔

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

”یہ کیا خدمت کرے پہلے اچھی بھلی پیٹنری بنالیتا تھا جب سے کنسلر بننے کے چکر میں پڑا ہے سب کام چھوڑ کر بیٹھ گیا ہے اس کے بچے کچھ کام کر لے آتے ہیں جس سے گھر کا گزارا چل رہا ہے ورنہ یہ سارا دن میرے فاس میں بیٹھا چائے پر چائے پیتا رہتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ چائے کی مت پیا کر شوگر ہو جائے گی مگر یہ مانتا ہی نہیں“ عبد الحمید منہری والا نے کہا۔

”میں کب چائے پلانے کو منع کر رہا ہوں میری جیب میں اس وقت پیسے نہیں ہیں، تم چھٹی آؤ میں نور و چائے پلاؤں گا۔“ قاسم عرف کھائی نے کہا۔

”جتنے کی چائے نہیں اس سے زیادہ ہمارا خرچہ ہو جائے گا ہمیں تمہاری چائے نہیں پینا بھی۔“

تو دیارے نے باقاعدہ ماتھہ جوڑتے ہوئے کہا۔

”ارے میرا جواد بھائی آیا ہے۔“ استاد پیارے  
نے اٹھ کر گلے ملتے ہوئے کہا۔

سال 2013ء عید مبارک عید مبارک عید مبارک

”جواد بھائی ہم میں اتنی ہمت کہاں کہ تمہاری کسی بات کا انکار کر دیں۔“ استاد پیارے کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

”اچھا کوئی خاص مقدمہ ہے۔“ استاؤ پیارے  
نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔  
”ہاں ایک مشہور مقدمہ ہے ملزم مفور تھا بڑی  
مشکل سے قابو آیا ہے تمہارے اخبار کے لیے اچھی  
خبر ہے۔“ اے ایس آئی جواد نے کہا۔  
”کسی حسد کا بھی اس مقدمے میں ذکر ہے۔“

ہوئی تو ہم تھانے چلے جاتے۔“ اے ایس آئی جواد نے کہا۔

عید مبارک عید مبارک عید مبارک  
نئے افق 197

”دلدار خان ہم اپنے مقدمے کے سلسلے میں ہمیں کچھ بتانا پسند کرو گے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں جو بتاؤں گا وہ چھاپو گے؟“ اس نے الشاہم

استاد پیارے نے مجھ سے پوچھا۔  
 ”میں جھوٹ نہیں بولوں گا، فہیم کا قتل میں نے کیا  
 ہے لیکن کول کے اکسانے پر کیا ہے۔“  
 ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہارا فہیم کو قتل کرنے کا  
 ارادہ نہیں تھا؟“ میں نے کہا۔

”یہ وہی مشہور فیل کیس ہے نا جو نور پلازہ کے فلیٹ میں ہوا تھا۔“ استاد پیارے نے پوچھا۔  
 ”ہاں یہ وہی مقدمہ ہے۔“

۱۱ اگست ۲۰۱۳ء عید مبارک عید مبارک عید مبارک



## ریاض ہٹ

آئیے اپنے پسندیدہ کردار انسپکٹر خالد سے ملے دیکھیے وہ مسروقہ بیروں کا پار کس سے اور کیسے ہر آمد کرتے ہیں۔

پہلے کہ میں کچھ کہتا سپاہی بشارت اندر داخل ہوا اور شاہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ملوث ہے۔“ اے ایس آئی جواد نے بتلایا۔



”دیکھو فیکے اور شہزادی! یہ ہمارے نئے تھانیدار ہیں ذرا مختلف ٹائپ کے ہیں اس لیے مالٹوں کا ٹوکرا واپس لے جاؤ اور چوہدری صاحب سے کہہ دینا کہ ان کا سلام نئے تھانیدار صاحب تک پہنچ گیا ہے۔“ دونوں منہ لٹکا کر واپس چلے گئے۔

”بہت خوب شاہد! تم نے بالکل سب کچھ میری حسب منشا کیا ہے۔“ میں نے اے ایس آئی کو داد دیتے ہوئے کہا۔

میں اگر چاہتا تو مالٹوں کا ٹوکرا رکھ بھی سکتا تھا لیکن یہ میرے اصول کے خلاف تھا مجھے امید تھی کہ اب چوہدری خود آئے گا اس جیسے چوہدریوں کو میں خوب جانتا تھا۔ میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔

”بھئی ذرا چوہدری اکبر دین کے متعلق کچھ بتاؤ۔“ ”سر! یہ روایتی قسم کا چوہدری ہے دراصل یہ بیس بائیس میل دور ایک گاؤں میں رہتا ہے یہاں اس کا بیٹا سلیم رہتا ہے جو اپنے آپ کو شہزادہ سلیم سے کم نہیں سمجھتا۔“

”اوہ۔“ میں نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ وا کیے جس گاؤں میں چوہدری رہتا تھا وہ ہمارے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا البتہ جہاں چھوٹا چوہدری رہتا تھا وہ علاقہ ہمارے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔

دو دن بعد چھوٹا چوہدری اپنے دو حواریوں کے ساتھ میرے سامنے آیا تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا وہ گورے چٹے رنگ کا ایک خوب صورت جوان تھا قد چھ فٹ سے ایک آدھ انچ ہی کم ہوگا۔

اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بندوں کو کہا۔ ”باہر گاڑی کے پاس انتظار کرو اور میرے کہنے پر میرے سامنے بیٹھ گیا۔“

”آپ اس تھانے میں نئے آئے ہیں میں کافی

دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے ملاقات کروں۔“ چند لمحے اس نے توقف کیا پھر گویا ہوا۔ ”لیکن سیانے کہتے ہیں کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔“ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔

”کیا مطلب؟“ ”بادشاہو! مطلب یہ ہے کہ میری کٹھی میں چوری ہوگئی ہے۔“

”اچھا!“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ آگے وہ کیا کہتا ہے۔

”آپ نے پوچھا نہیں کہ کیا چوری ہوا ہے؟“ ”تم خود ہی بتاؤ گے تو پتا چلے گا نا۔“ میں نے روانی کے ساتھ کہا۔

”جناب! ہیروں کا ہار چوری ہوا ہے بہت قیمتی تھا۔“

”اوہ! لیکن کب اور کیسے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو نہیں بتایا جاسکتا کہ کب چوری ہوا ہے کل میری بیگم نے ایک شادی میں جانا تھا رات کا فٹنشن تھا جو بچی اس نے تجوری کھولی اور ہار نکالنا چاہا تو وہ غائب تھا۔“

”آخری بار کب ہار تجوری میں رکھا گیا تھا؟“ ”ایک ہفتہ پہلے۔“

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ اس وقت میں اور چھوٹا چوہدری کمرے میں اکیلے تھے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل صفدر اور سپاہی ناظم کو بلا کر انہیں ساری بات بتائی اور چھوٹے چوہدری کے ساتھ بھیج دیا۔ انہوں نے چار گھنٹے بعد آ کر مجھے رپورٹ دی۔ تجوری نمبروں سے کھلنے والی ہی نظا ہر اس کو کوئی غیر متعلقہ آدمی نہیں کھول سکتا تھا اس میں کیش بھی تھا۔

گھر میں دو نوکر تھے ایک باورچی اور ایک گھر میں

کام کرنے والی عورت ایک ڈرائیور بھی تھا جو سو وٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ وہ گھر کے اندر بھی نہیں گیا تھا۔ عورت جوان تھی اور خوب صورت تھی کانسٹیبل نے تو اس کے سرایا کا پورا نقشہ کھینچ دیا تھا۔ شام کو چوہدری اکبر دین بہ نفس نفیس موجود تھا میرے کمرے میں۔

اس نے دو گھوڑا بوکی کی قمیص اور ہنگے لٹھے کی شلوار زیب تن کی ہوئی تھی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہوگی۔ اس عمر میں بھی اس کی صحت قابل رشک تھی۔ چھوٹے چوہدری کی طرف سے میں نے رپورٹ درج کر لی تھی۔ چوہدری اکبر دین نے پہلے تو ذرا رعب سے بات کی جب میں نے ذرا تھانیدارانہ لہجے میں اسے احساس دلایا کہ وہ تھانے میں بیٹھا ہے تو اس کی ساری اکڑ ہوا ہوگئی۔

میں نے اس کے بھیجے میں اچھی طرح یہ بات بٹھادی کہ تفتیش پوری ایمان داری کے ساتھ ہوگی۔ وہ چلا گیا تو میں نے کانسٹیبل رمضان کو بلا کر اس کے ذمہ ایک ڈیوٹی لگائی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

چھوٹے چوہدری نے شک ظاہر کیا تھا کہ فریدہ اس معاملے میں ملوث ہو سکتی ہے۔ فریدہ ان کی نوکرانی کا نام تھا بقول اس کے وہ کمرے کی صفائی بھی کرتی تھی کپڑے اور برتن وغیرہ بھی دھوتی تھی تجوری والے کمرے میں اس کا آنا جانا تھا لیکن اس بات کا وہ تسلی بخش جواب نہیں دے سکا کہ اس نے نمبروں سے کھلنے والی تجوری کیسے کھولی ہوگی۔

فریدہ شام کو کام ختم کر کے اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ جب کہ باورچی بھی اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ فریدہ کو تھانے بلانے یا اس کے گھر جا کر ملاقات کرنے کے متعلق میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

کانسٹیبل رمضان نے اگلے دن مجھے رپورٹ دی یہ رپورٹ چوہدری اکبر دین اور اس کے بیٹے کے

متعلق تھی آگے بڑھنے سے پہلے اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے چوہدری اکبر دین روایتی چوہدری تھا اس کا ایک ہی بیٹا تھا سلیم! اس کے علاوہ ایک بیٹی زہری بھی جو ابھی کنواری تھی سلیم کا شہر میں آڑھت کا کاروبار تھا۔

وہ شہزادہ بنا ہوا تھا دولت کی فراوانی نے اسے خود سر بنادیا تھا جو چیز حاصل کرنا چاہتا اسے حاصل کر کے رہتا تھا۔ اس شہر میں واقع بازار حسن کی ایک شہزادی اسے پسند آ گئی اور اس نے اسے قیمت دے کر حاصل کر لیا بڑا چوہدری اس کی شادی میں خود شریک ہوا تھا۔ وہ دل سے راضی تھا یا نہیں اس کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے یہ سب تو تفتیش کو گہرائی میں لے جانے سے ہی معلوم کیا جاسکتا تھا۔

سلیم کی بیوی کو شہزادی اس لیے لکھا ہے کہ اس کا نام ہی شہزادی تھا دو پہر کے بارہ بج چکے تھے اور اس وقت اے ایس آئی شاہد میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور ہم ہیروں کے ہار کی چوری کے متعلق ہی بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے ساری صورت حال سے اسے آگاہ کر دیا تھا۔

”سر! آپ کا کیا خیال ہے؟ فریدہ کا ہاتھ اس چوری میں کس حد تک ہو سکتا ہے۔“ اس نے حسب عادت اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو بھئی ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”فریدہ سے ملاقات کے بعد ہی کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔“

”سر! اسے تھانے بلانے کا بندوبست کیا جائے؟“ ”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ تم اس طرح کرو کہ اپنی کسی خبر عورت سے کہو کہ شام کے بعد اسے



تھانے لے آئے اور اس طرح لائے کہ چھوٹے چوہدری کو پتا چل جائے کہ فریدہ کو تھانے بلایا گیا ہے۔ یہ میں کی ڈرکی وجہ سے نہیں کر رہا تھا بلکہ کیس کی صورت حال ہی ایسی تھی۔

شام کے بعد بلانے کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ بندوں کو پتانہ چلے بہر حال جب فریدہ میرے سامنے آئی تو میں اس کا حسن دیکھ کر مہموت رہ گیا۔ اس کے حسن میں ایک پاکیزگی تھی میرے دل نے فوراً کہہ دیا کہ خالد یہ عورت چور نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ سے قتل ہو سکتے ہیں میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دیا، مخبر عورت کو باہر ہی بیٹھنے کو کہا اور فریدہ کو اپنے سامنے بٹھالیا۔

چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں اسے اصل بات کی طرف لے آیا۔ اسے یہ نہیں بتایا کہ چھوٹا چوہدری اس کے اوپر شک کا اظہار کر رہا ہے۔

”فریدہ! تمہارے خیال میں چور کون ہو سکتا ہے؟“ تھانے دار صاحب! میں اس کے متعلق کیا بتا سکتی ہوں؟ میں تو ایک غریب سی عورت ہوں اپنا اور اپنے خاوند کا پیٹ پالنے کے لیے چوہدری اور اس کی بیگم کے گندے کپڑے بھی دھوئی ہوں برتن بھی دھوئی ہوں اور.....

”فریدہ یہ سب مجھے معلوم ہے، اچھا تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارا خاوند کچھ نہیں کرتا۔“

”کرتا ہے سارا دن نشہ پی کر چار پائی توڑتا ہے اور رات کو.....“

”چوہدری سلیم کیسا آدمی ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”جیسے سب چوہدری ہوتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس کی بات میں مجھے کوئی خاص بات محسوس ہوئی تھی۔

”کیا فائدہ ہے تمہارا صاحب! آپ نے انصاف ٹھوڑی کرنا ہے۔“ میرے کان کھڑے ہو گئے۔

”تم بتاؤ تو سہی اس نے تم پر شک کا اظہار کیا ہے؟“ میں نے لوہا گرم دیکھ کر جیج چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا!“ وہ ہنس پڑی۔ ”وہ یہی کر سکتا ہے تمہارا صاحب! خدا نے غریبوں کو خاص کر غریب عورتوں کو اتنا مجبور کیوں بنایا ہے اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی مجھے ریتی کپڑوں اور روپوں کا لالچ دیتا رہتا تھا میں نے اسے ایک دن کھری کھری سادی وہ پیش میں آ گیا اور دھمکیوں پر اتر آیا اور یہ بھی بتا دیا کہ جو چیز مجھے پسند آ جائے اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتا ہے پھر اس نے شہزادی کی مثال دی تھی۔“ فریدہ کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں ہوئی تھیں لیکن اس میں آپ کے مطلب کی کوئی بات نہیں۔

صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ سلیم اور شہزادی کا آپس میں بہت پیار تھا، فریدہ نے شہزادی کو کچھ نہیں بتایا تھا اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ چوہدری کی نوکری چھوڑ دے۔ وہ باحیا اور کردار کی پختہ تھی اگر چاہتی تو بہت سے مردوں کو انگلیوں پر نچا سکتی تھی۔ مخبر عورت کے ساتھ اسے رخصت کرنے کے بعد میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ صبح جب میں تھانے پہنچا تو بارش شروع ہو گئی جو دوپہر تک برتی رہی۔ ساڑھے بارہ کے بعد بارش ڈرار کی لیکن آسمان ابھی بھی بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ان کے تہہ بہ تہہ تھے کہ ابھی وہ ٹلنے والے نہیں لیکن موسم کو دیکھ کر کام تو نہیں روکے جاسکتے۔

میں نے سپاہی بشارت کو دو چھتریوں کا بندوبست کرنے کے لیے کہا جب وہ چھتریاں لے کر آیا تو میں نے اس کو ساتھ لیا اور چوہدری سلیم کی کوشی کی طرف

ہمارے قدم بڑھنے لگے۔ چھتریاں سپاہی بشارت نے بند کر کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں۔ جونہی آسمان دوبارہ رونا شروع کرتا ہم انہیں استعمال کر سکتے تھے۔

چوہدری کو ہم نے پہلے ہی پیغام بھیج دیا تھا وہ ہمیں کوشی میں ہی مل گیا، کچھ رسمی باتوں کے بعد وہ ہمیں ایک نجی سہائی بیٹھک میں لے گیا۔

اس نے ہماری خاطر تواضع کرنے کی کوشش کی لیکن ہم نے اسے منع کر دیا اور کہا ہمیں تجوری والے کمرے میں لے جائے۔

جس کمرے میں تجوری پڑی تھی وہ ایک کھلا کھلا کمرہ تھا، ڈبل بیڈ پر خوب صورت چادر بچھی ہوئی تھی۔ عام تکیوں کے علاوہ دو گول تکیے بھی تھے، ڈبل بیڈ کے بالکل سامنے تجوری رکھی گئی تھی۔ میرے کہنے پر چوہدری نے اسے کھول کر دکھایا اور یہ بھی بتایا کہ ہیروں کے ہار والا ڈبہ کہاں رکھا گیا تھا، یہ کام ہیڈ کا ٹیکسیل صفدر اور سپاہی ناظم کر کے گئے تھے، میں کچھ اور اندازہ لگانا چاہتا تھا وہ میں نے لگا لیا۔

ہار کی قیمت آج کے حساب سے لاکھوں میں تھی۔ میں چوہدری کو یہ بھی باور کرانا چاہتا تھا کہ پولیس پوری ایمان داری اور حاشائی سے نفیشت گر رہی ہے۔ میرے سینئر آفیسر ز کو مجھ پر اعتماد تھا اسی لیے مجھے اس حساس تھانے میں بھیجا گیا تھا۔ اس کی حساسیت کے لیے بازار حسن کا اس کی حدود میں پایا جانا ہی کافی تھا۔ بڑے چوہدری کے متعلق مجھے رپورٹ ملی تھی کہ سیاست میں اس کا برا عمل دخل ہے اس کے علاقے کا موجودہ ایم پی اے اس کی حمایت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے جیتا تھا، آپ میری پوزیشن سے آگاہ ہو گئے ہوں گے بہر حال میں بہت کچھ سوچ رہا تھا واپس تھانے آنے سے پہلے میں نے چوہدری کی بیگم سے بھی انٹرویو کر لیا تھا وہ زیادہ حسین

نہیں تھی شوباز لگتی تھی، نام نگینہ تھا۔ اس کے چہرے پر صرف ایک کالائل ہی نمایاں تھا اس سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کا ذکر کرنا ابھی مناسب نہیں۔

اس دن اس کیس کے سلسلے میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی البتہ تھانے کے باقی سلاسل چلتے رہے، چوہدری سلیم اپنی فطرت سے مجبور تھا وہ اپنی محبوبہ کو بیاہ لایا تھا لیکن پھر بھی فریدہ پر رال پڑا ہوا تھا۔ یہ بات بھی تھی کہ فریدہ نگینہ سے زیادہ خوب صورت تھی۔ اس میں ایک سادگی بھی شوباز نہیں تھی۔

عام مرد کی بھی یہ فطرت ہے کہ اپنی بیوی سے (جو پہلے اس کی محبوبہ رہ چکی ہوتی ہے) جلدی اکتا جاتا ہے۔ سلیم تو چوہدری بھی تھا اور اپنے آپ کو راج کمار اور نژادہ سمجھتا تھا۔

اگلی صبح مطلع صاف تھا آسمان دھل کر نکھر گیا تھا، سفید بادلوں کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ادھر سے ادھر پڑ رہے تھے۔ میں نے اے ایس آئی شاہد کو بلا کر کہا مجھے بڑے چوہدری کے متعلق پوری رپورٹ چاہیے کہ جب چھوٹے چوہدری سلیم نے شہزادی کے ساتھ شادی کی تو بڑے چوہدری کا رویہ کیسا تھا اور یہ سب آرام سے ہو گیا تھا یا.....

یہ سب معلومات کے لیے اسے بڑے چوہدری کے گاؤں جانا تھا اور خفیہ طور پر سب کچھ پتا کرنا تھا، دو دن بعد اے ایس آئی شاہد سے ملاقات ہوئی۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ دوسرا اے ایس آئی ابراہیم آج کل چھٹی پر تھا۔

شاہد نے جو نقیشت کی تھی آگے بڑھنے سے پہلے اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔

چوہدری اکبر دین جیسا کہ ذکر آچکا ہے ایک روایتی چوہدری تھا لیکن سیاسی ذہن بھی رکھتا تھا وہ اس چیز کا قائل تھا کہ سامنے آنے کی بجائے پس پردہ رہ



کرنجافلوں اور دشمنوں کو ذلیل کیا جائے ان کی پیٹھ میں  
خنجر بھی گھونپا جائے اور خنجر والے ہاتھ کو مخفی بھی رکھا  
جائے۔ چھوٹا چوہدری (سلیم) خود سرضدی اور ہٹ  
دھرم تھا۔ بھی بھی وہ صرف اپنی بات رکھنے یا منوانے  
کے لیے آخری حد تک بھی چلا جاتا تھا اسے گاؤں اور  
زمین داری سے ذرہ برابر بھی لگاؤ یا دلچسپی نہیں تھی اس  
نے اسی شہر میں تعلیم حاصل کی دوران تعلیم ہی اس  
کے قدم بازار حسن کی طرف جانے شروع ہو گئے  
تھے۔ اس شہر میں اس کے ماموں رہتے تھے سلیم ان  
کے پاس ہی رہتا تھا۔

تسلیم کی ممانی کو جگر کا کینسر تھا، جس دن سلیم بی  
اے کا آخری پیپر دے کر آیا اس کی ممانی کا انتقال  
ہو گیا، اس کے ماموں چوہدری سرفراز بے اولاد تھے  
بیوی کے انتقال کے بعد ان کا شہر سے دل اجاٹ  
ہو گیا۔ انہوں نے اپنی بیوی یعنی سلیم کی ممانی کی قبر  
بھی گاؤں میں جا کر بنائی۔ چوہدری سرفراز کا اس شہر  
میں آڑھٹ کا کاروبار تھا، کوٹھی اور کاروبار اس نے  
اپنے بھانجے کے سپرد کیا اور خود گاؤں سدھار گیا ادھر  
اس دوران سلیم کو بازارِ حسن کی ایک طوائف شہزادی  
پسند آ گئی۔ شہزادی نے ایک دن اسے کہا کہ وہ اسے  
اس بدنام جگہ سے لے جائے اس نے بڑی ناکہ سے  
بات کی تو اس نے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر دیا۔  
خود سر سلیم نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا حالاں کہ رقم  
اتنی زیادہ تھی کہ اس جیسے چوہدری کو کبھی ایک دفعہ  
پسند آ گیا تھا اس نے بڑے چوہدری صاحب  
(اے والد) سے بات کی انہوں نے اسے سمجھایا کہ  
یہ طوائفیں کسی کی نہیں ہوتیں وہ اس کا خیال دل سے  
نکال دے ماموں نے بھی سمجھایا لیکن چوہدری سلیم  
نے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔ بڑے چوہدری نے  
بڑے مشکل سے یہ کڑوا گھونٹ بھرا۔

کے چہرے پر نظریں بہا دیں۔ چند لمحوں کے لیے اس نے توقف کیا، تھوک نگلا پھر گویا ہوا۔

”مجھے تو چوری میں شہزادی کا ہاتھ لگتا ہے۔“ پھر میرے ذرا قریب ہو کر راز دارانہ لہجے میں بولا۔ ”آپ جہانگیرہ آدمی ہیں بھانت بھانت کے لوگوں سے آپ کا پالا اڑتا رہتا ہے ان طوائفوں کا کیا اعتبار ہے؟“

”لیکن چوہدری صاحب! اس سارے گورکھ وندے میں سلیم کی زندگی کو لاحق خطرے والی بات ذرا ہضم نہیں ہو رہی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس آپ اسے میری چھٹی حس کا کمال کہہ لیں۔“ اس کے بعد چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ چلا گیا اور میری توقع کے عین مطابق یہ کہہ گیا کہ ابھی اس بات کا پتا سلیم کو نہیں لگنا چاہیے۔ مجھ جو مناسب سمجھنا تھا وہ کرنا تھا اس کی بات پر من و عن عمل تھوڑی کرنا تھا اب آپ میرے مالٹوں کا ٹوکرا نہ لینے کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے۔

سیانے کہتے ہیں کہ اگر گھنڈا رکشی کا احسان یا تحفہ لے لے تو اس کے لیے انصاف کرنا اور ایمان داری سے نفی کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب کئی راستے میرے سامنے تھے لیکن ظاہر ہے ایک ہی راستے نے مجھے منزل تک پہنچانا تھا۔

چھوٹے چوہدری نے فریدہ پر شک کا اظہار کیا تھا جب کہ بڑا چوہدری اپنی بہوی طرف اشارہ کر رہا تھا اور اس کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ صرف یہ کہہ رہا تھا کہ طوائف کا کوئی اعتبار نہیں۔ میں نے فریدہ کے متعلق یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ چور نہیں ہو سکتی لیکن یہ کوئی حتمی اور مستند بات نہیں تھی۔ چہرے بھی، ہڈی بھی دے جاتے ہیں۔

رات کو جب میں کوارٹر میں اپنی چارپائی پر لیٹا تو











بھائی کے لیے: والدہ خود پڑھیں، بعد نماز عشاء

سورۃ العصر 41 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ  
دروذ شریف دعا کریں فرماں بردار بن جائے۔  
کرن بتول..... میاں والی

جواب: رات کو سونے سے پہلے اول و آخر  
25-25 بار درود ابراہیمی اور درمیان میں سو دس  
النصر 125 بار پڑھ کر معاشی حالات اچھے ہونے کی  
دعا کریں نافع نہ ہو۔  
فاطمہ اکرام..... ٹوبہ ٹیک سنگھ  
جواب: رشتہ کے لیے سورۃ الفوقان آیت نمبر

70-74 مرتبہ اول و آخر درود 11-11 مرتبہ درود شریف۔ امتحان میں کامیابی اور بیرون ملک جانے کے لیے سورۃ القویٰ شہر نماز کے بعد 11 مرتبہ۔ نمبرہ..... ٹیڈ والہیار

جواب: صرف آیات شفاء پڑھیں بعد

نماز مغرب۔ سورۃ الفاتحہ 41 مرتبہ اول و آخر  
11-11 مرتبہ درود شریف زیتون کے تیل پر دم کریں  
تیل سے روزانہ صبح و شام ہلکی ماسھ کریں جہاں دھبے  
ہیں۔ (یہ وظیفہ تیل پر ایک مرتبہ ہی کرنا ہے)۔  
بعد نماز عشاء روزانہ سورۃ الفاتحہ 41 مرتبہ  
اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف اور ایک بوتل پر  
بھی دم کریں وہ پانی استعمال کریں زیادہ سے زیادہ۔

جب پانی ختم ہو جائے پھر سے یہ دم کریں۔  
صبا حسن ..... سیالکوٹ  
جواب:- مسئلہ نمبر:- ”سورۃ النصر“ 125

مرتبہ اول و آخر 25، 25 مرتبہ درود ابراہیمی بعد نماز  
عشاء روزانہ زمین کے لیے۔ پڑھتے وقت مقصد  
ذہن میں رکھیں۔  
مسئلہ نمبر ۲: تازہ دودھ اور مانی برابر ملا کر پیئیں۔  
”یا شافی یا کافی“ 7 بار پڑھ کر کسی پر پھونک مار کر

اول و آخر 11, 11 مرتبہ درود شریف پڑھ کر پورے

جسم پر ہاتھ پھیریں۔

مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد سورۃ فلق،  
سورۃ الناس 19، 19 مرتبہ دم بھی کریں۔  
ع۔ ع۔ السلام..... مرگودھا

جواب:- بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت  
نمبر 74، 70 مرتبہ اول و آخر 11، 11 مرتبہ درود  
شریف۔ دعا کریں جلد اور اچھے رشتے کے لیے۔

بعد نماز مغرب اور عشاء سورۃ الفلق سورۃ  
الناس 19، 19 مرتبہ بندش ختم کرنے کے لیے۔  
”یا قوی“ فرض نماز کے بعد 11 مرتبہ سر پر ہاتھ  
رکھ کر سبق پڑھنے سے پہلے 7 مرتبہ سورۃ  
قریش۔

ان..... ضلع چکوال  
جواب: رشتے کے لیے بعد نماز فجر سورۃ  
الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول و آخر  
11، 11 درود شریف۔  
بعد نماز مغرب اور عشاء سورۃ الفلق، سورۃ

الناس 19, 19 مرتبہ بندش اور کاوٹ کے لیے۔  
جو کام شروع کریں پہلے استخارہ کر لیا کریں۔  
بعد نماز عشاء 11 مرتبہ سورۃ القدر اول  
آخر 11, 11 مرتبہ درود شریف۔ روزی کے لیے  
دعا کریں۔

ثوبیہ..... فیصل آباد  
جواب:- بعد نماز فجر سورۃ یسین 3 مرتبہ پڑھ کر اپنے مسئلے کے لیے دعا کریں۔

سیما پروین..... کراچی

جواب:- بعد نماز عشاء 111 مرتبہ سورۃ  
القریش اول و آخر 11, 11 مرتبہ درود شریف۔

عائشہ رحمت علی..... گوجرانوالہ



جواب:- (۱) جب تک ضرورت محسوس کریں وظیفہ جاری رکھیں۔ خاص دنوں میں نہ پڑھیں۔  
سورۃ ”بیسہ“ پارہ ۳۰ صبح و شام 3,3 مرتبہ پانی پر دم کر کے پلائیں۔ روزانہ اول و آخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔

رقیب بی بی..... جام پور

جواب:- بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ دنوں پڑھیں۔ اپنے اپنے مسئلوں کے لیے۔  
رضیہ بیگم..... لاہور

جواب:- وظیفہ جاری رکھیں۔

چاروں قل شریف 3 مرتبہ۔ لا حول ولا قوۃ  
الا باللہ العلی العظیم، ایک سبج۔ اول و آخر  
11,11 مرتبہ درود شریف۔  
آپ کی بیٹی پانی پر پڑھ کر روزانہ آپ پر چھڑکے  
پورے جسم پر۔

نسرین اختر..... میانوالی

جواب:- نماز کی پابندی کریں۔

رشتہ کے لیے سورۃ الفرقان آیت نمبر 74،  
70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ بعد  
نماز فجر۔

سامان کی واپسی اور زمین کے لیے:- سورۃ  
یسین 3 مرتبہ بعد نماز فجر دعا بھی کریں۔

دکان کے لیے:- سورۃ الفلق اور سورۃ  
الناس 21,21 مرتبہ پڑھ کر پانی دکان میں  
چھڑکیں روزانہ۔  
111 مرتبہ سورۃ القریش پڑھیں بعد نماز  
عشاء اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ دکان  
چلے گی انشاء اللہ۔

مسئلہ ۵:- اللہ سے توبہ کرو، حلال کھاؤ۔

یسری..... ہری پور

جواب:- بہتر استخارہ آپ خود کریں۔  
طریقہ عالم سے پوچھ لیں پھر کوئی فیصلہ کریں۔  
اللہ آپ کے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ آمین



نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف  
انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔  
عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی  
صورت میں ادارہ کی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔  
ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے ستمبر 2013ء

گھر کا مکمل پتا

نام والدہ کا نام

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں

## خوشبو سکھن

عمر اسرار

آج یاد بہت تم آئے ہو

گہرے کالے بادلوں میں  
رم بھکم برکھا ساون میں  
آج یاد بہت تم آئے ہو  
سرد ہوا کی لرزش میں  
پھولوں کی ہر جنبش میں  
آج یاد بہت تم آئے ہو  
اڑتی نیلی تتلیوں میں  
قوس قزح کے سب رنگوں میں  
آج یاد بہت تم آئے ہو  
چاند تاروں کے پہرے میں  
غلس تھا تیرا لہروں میں  
آج یاد بہت تم آئے ہو  
کچھ کٹھی میٹھی باتوں میں  
کچھ دلربا سی باتوں میں  
آج یاد بہت تم آئے ہو  
آج یاد بہت تم آئے ہو

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

گیت

دل فریبی سے کچھ کہنا ہے  
تمہاری خواہشوں میں اب مجھے رہنا ہے  
ابتداء عشق میں اک کام تو کیجیے  
مسکرا کے شرم سے میرا نام تو لیجیے  
پھر قربتوں کا اک سلسلہ رکھنا ہے  
تمہاری خواہشوں میں اب مجھے رہنا ہے  
دل فریبی سے کچھ کہنا ہے

بیار کی دولت کیا چھلکتی ہے نیوں سے  
دیکھو تم ٹرپ رہا ہوں مہینوں سے  
آخر گلشن کے پھولوں کو کھلانا ہے  
تمہاری خواہشوں میں اب مجھے رہنا ہے

دل فریبی سے کچھ کہنا ہے

کیوں دل بھڑکتا ہے سکنی ہواؤں میں  
کوئی نازا فرین ہے مست آداؤں میں  
مجھے زرو جواہر سے کیا لینا دینا ہے  
تمہاری خواہشوں میں اب مجھے رہنا ہے  
دل فریبی سے کچھ کہنا ہے

سید عبداللہ شاہد..... حیدرآباد

غزل

آج پھر اس کی یاد دلا دی بارش نے  
دل میں لگی آگ بجھا دی بارش نے  
اس کے ذکر سے ہو گئی میری آنکھیں نم  
مگر دوستوں یہ ساری بات چھپا دی بارش نے  
سنا ہے وہ بھی رویا ہے آج بہت  
شاید اسے بھی میری یاد دلا دی بارش نے  
وہ بے وفا ہوا تو پھر کیا ہوا  
آج میرے ساتھ رو کر وفا نبھا دی بارش نے  
شمن عبدالرحمن..... کراچی

غزل

دل تو گھائل کر دیا اس نے مگر اچھا کیا  
روٹھنے والے نے مجھ سے روٹھ کر اچھا کیا  
جو اچالوں کی فراوانی کا تھا پیغامبر  
اپنے ہاتھوں سے جلایا اس نے گھر اچھا کیا  
دیکھ لی ہیں اس نے اپنی سمت اٹھتی انگلیاں  
آج وہ آیا نہیں ہے بام پر اچھا کیا  
اور کیا ہوتا نہ جانے حال دل بیمار کا  
لوٹ کر آیا نہیں ہے نامہ بر اچھا کیا

نئی آفاق 213 اگست 2013ء

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

نئی آفاق 212 اگست 2013ء

عید مبارک عید مبارک عید مبارک











کان..... وزیر ڈاک و تار  
معدہ..... وزیر خوراک  
دل..... وزیر مالیات  
ہاتھ..... وزیر محنت  
ناک..... وزیر سچت  
دانت..... وزیر میرات  
آنکھیں..... وزیر قانون  
جلد..... وزیر دفاع  
ٹانگیں..... وزیر مواصلات  
زبان..... وزیر نشریات  
مسام..... وزیر داخلہ

ریاض بٹ..... حسن ابدال  
جواہر پارے  
☆ بہت زیادہ بارش سے تو سنگ مرمر میں بھی  
سورخ ہو جاتا ہے۔  
☆ جب تحائف دینے والے نامہ ریان  
ہو جائیں تو بڑے بڑے تحفے بھی اپنی اہمیت کھو  
دیتے ہیں۔  
☆ ایک ایمان دار انسان اللہ تعالیٰ کا بہترین  
شاہکار ہے۔  
☆ جس شخص کو مفتوح ہونے کا خدشہ ہو وہ  
شکست ضرور کھاتا ہے۔  
☆ جیونی سے بڑھ کر کوئی خاموش تعلیم نہیں دیتا۔  
☆ صرف احمقوں کو ہی دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔  
زینب فرحان..... ملتان

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم

نہ فرمایا  
ایک آدمی نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔  
اے اللہ کے پاک رسول! میرے کچھ رشتہ دار  
ہیں جن کے حقوق میں ادا کرتا ہوں اور وہ میرے

حقوق ادا نہیں کرتے۔ میں ان کے ساتھ حسن سلوک  
کرتا ہوں وہ میرے ساتھ بدسلوک کرتے ہیں۔ میں  
ان کے ساتھ حلم و بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ  
میرے ساتھ جہالت برتتے ہیں۔  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا..... اگر تو ایسا ہی  
ہے جیسا تو کہتا ہے تو گویا ان کے چہروں پر سیاہی پھیر  
رہا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے مقابلے میں تیرا مددگار  
رہے گا۔ جب تک تو اس حالت پر قائم رہے گا۔  
احمد ابدالی..... کوئٹہ

ووٹر

انکشن میں دو امیدوار ایک دوسرے کے خلاف  
ڈٹ گئے۔ دریا کے کنارے ایک جھگی آباد تھی۔ اس  
میں ایک آدمی رہتا تھا۔ ایک دن پہلا امیدوار ووٹر کے  
پاس پہنچا اور ووٹ کا خواستگار ہوا۔ اس پر جھگی نشین نے  
کہا۔ یہ میری بھینس کھڑی ہے اور یہ میں کھڑا ہوں۔  
ووٹ اور بھینس میں سے جو چی جاتا ہے لے لو۔  
”بابا! مجھے تمہارا ووٹ چاہئے ووٹ درکار ہے  
بھینس نہیں۔“ امیدوار بولا۔  
”آخر تم اپنی بھینس کیوں دینا چاہتے ہو؟“

امیدوار نے پوچھا۔  
”اس لیے۔“ جھگی نشین نے کہا۔ ”اگر ووٹ نہیں  
دیا تو تمہارا مخالف امیدوار بھینس کھلو لے گا اور اسے  
ووٹ دیا تو بھینس تم نے نہیں چھوڑنی۔ چنانچہ یہ بہتر  
نہیں کہ تم خود فیصلہ کر لو کہ ووٹ کسے درکار ہے اور  
بھینس کسے؟“

رضوانہ خان..... چکوال

بقائے نام

نوشیرواں کا محل جب مکمل ہوا تو اس نے داناؤں  
کی جماعت سے کہا ”دیکھو اس میں کوئی خرابی یا نقص  
نہیں۔“ سب نے کہا۔ کوئی خرابی نہیں۔ مگر یہ کہ محل

کے کونے میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہے۔ اس  
جھونپڑے سے دھواں نکلتا ہے اور محل کی دیوار کو کالا  
کرتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو نہایت مناسب ہے۔“  
نوشیرواں نے کہا۔ یہ گھر ایک بڑھیا کی ملکیت  
ہے۔ اس نے عمر گزاری اب اس کی زندگی کا سورج  
ڈھلنے والا ہے۔ جس وقت میں نے محل کی بنیاد رکھی یہ  
گھر رکاوٹ تھا۔ میں نے بڑھیا کے پاس آدمی بھیجا  
کہ جتنی چاہے رقم لے لے اور زمین بیچ دے۔  
بڑھیا نے کہا۔ میں نے تیری ساری دنیا میں مملکت  
دیکھی کیا تو اس غریب کا گھونسلہ نہیں دیکھ سکتا۔“

میں اس بات سے متاثر ہوا اور پھر کچھ نہ کہا۔ حتیٰ  
کہ محل تعمیر ہو گیا۔ میں نے دھوئیں کی دجہ پوچھی۔  
اس بڑھیا نے کہا۔ میں اپنے لیے کھانا پکانی ہوں۔  
میں نے تب بھی کچھ نہ کہا اور ایک آدمی بھنے ہوئے  
مرغ کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور کہلوا دیا۔ ”اے  
ماں! ہر رات ایک خوان قسم قسم کا تجھے ملے گا تو  
آگ نہ جلایا کر۔“

اس نے جواب دیا۔ اس دنیا میں کتنے بھوکے  
فاقوں کے مارے جلے ہوئے دل والے ہیں اور میں  
بھنا ہوا مرغ کھاؤں۔ میرے لیے جھونپڑی قائم  
رہنے دے کیونکہ یہ تیرے انصاف کے محل کی زینت  
ہے۔ تیرا محل بہت سال نہیں رہے گا اور میرے گھر کی  
کہانی زمانے کے صفحے پر لکھی جائے گی۔“  
اور میں بڑھیا کی ہمسائیگی پر راضی ہو گیا۔

فاروق احمد..... کراچی

موئن جو دڑو کی دریافت

یہ تقریباً ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ جب ایک انگریز  
ماہر آثار قدیمہ سر جان مارشل موجودہ لاڑکانہ شہر سے  
صرف ستائیس کلومیٹر دور ری واقع ریت کے ٹیلے اور  
ان پر اگی ہوئی جھاڑیاں دیکھ رہے تھے۔ سر جان

مارشل نے محسوس کیا کہ یہاں پر یقیناً کوئی آبادی ہو  
گی جو تباہ ہو گئی ہوگی اور ہوانے ریت کو اٹھا کر اس کو  
دفن کر دیا ہوگا۔ جب کھدائی کی گئی تو وہاں پر واقعی ایک  
پورا شہر کھنڈرات کی صورت میں برآمد ہوا۔ جس کو  
موہن جو دڑو یعنی مردوں کا ٹیلہ کا نام دیا گیا جو کہ دنیا  
کی پرانی تہذیبوں میں سے ترقی یافتہ علاقے میں  
شمار کیا گیا۔

محمد یعقوب حماس..... ڈیرہ غازی خان  
لفظ باتیں کریں  
بزدل آدمی موت آنے سے پہلے ہی بارماتا ہے  
لیکن بہادر آدمی صرف ایک بار ہی مرتا ہے۔  
جو شخص زیادہ سوچنے والا ہوتا ہے وہ سب سے صحیح  
کام کرتا ہے۔

دنیا اپنی حالت پر قائم رہے گی لیکن اس قفس کے  
اسیر ہمیشہ بدلتے رہیں گے۔  
قانون قدرت ہمیشہ کسی جاندار کو قید نہیں رکھتا۔  
زندگی میں میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں ہمیشہ  
پندرہ منٹ پہلے اپنے کام پر موجود ہوتا ہوں۔  
دلوں کو فتح کرنے کے لیے تلوار کی نہیں عمل کی  
ضرورت ہوتی ہے۔

کوئی شیشہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر نہیں پیش  
کر سکتا جتنی اس کی بات چیت۔  
میں خوش رہتا ہوں کیونکہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔  
نوشیہ جہانگیر..... موہن آباد کشمیر

فتح مندی کی چابی  
اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہو تو صرف  
انسانی سعی و تدبیر سے کامیابی کا دروازہ نہیں کھل سکتا،  
اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہی نیک بختی حاصل ہوتی  
ہے لہذا اسے ہمیشہ مانگتے رہنا چاہیے۔  
اگر خدائے ذوالجلال والا کرام کوئی چیز نہ دینا



چاہے تو کوئی اچھا سا بہادر بھی اپنی بہادری سے بھی اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔

مرسلہ: بشری بانو..... حافظ آباد

سچا ہمدرد کون؟

جو شخص ہمیں نقصان دہ چیز سے آگاہ کرے وہ خیر خواہ کہلاتا ہے، تنہائی میں عیب اور غلطی بتانے والا واقعی ہمارا خیر خواہ ہوتا ہے، عام طور سے منہ پر تعریفی کلمات کہنے والے سب دوست نہیں ہوتے، جب تک نقص اور کوتاہی کے بارے میں توجہ نہ دلائی جائے آدمی اس کو اپنا کمال ہی سمجھتا رہتا ہے لہذا ایسے شخص کی قدر کرنی چاہیے۔

مرسلہ: سلیم احمد نیاز..... ڈگری

احسان کی ترغیب

ایک راستے میں ایک نوجوان میرے سامنے آیا، ایک بکری اس کے پیچھے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا یہ رستی اور پٹا ہے اس کی وجہ سے بکری تیرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ اس نے فوراً اس کا پٹا اور زنجیر کھول دی اور دائیں بائیں طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ بکری راستہ پر اسی طرح اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی اس لیے کہ اس کے ہاتھ سے جو اور گھاس چارہ کھائے ہوئے تھی۔ جب وہ کھیل کود سے اپنی جگہ واپس آیا تو مجھے دیکھ کر بولا اے عقل مند! یہ رستی اس کو میرے پیچھے نہیں لیے چلتی ہے بلکہ احسان کی رستی اس کے گلے میں پڑی ہوئی ہے، ہاتھی والا چوں کہ ہاتھی پر احسان اور مہربانی کرتا ہے اس لیے وہ مستی کی حالت میں بھی اس پر حملہ نہیں کرتا ہے۔

فائدہ: اے نیک آدمی! بروں پر مہربانی کر، کتابجب تمہاری روٹی کھاتا ہے تو تمہاری حفاظت بھی کرتا ہے۔

مرسلہ: ایس اکبر خان..... بھکر

روزی کے بارے میں ارشادات

اگر عقل پر روزی کا مدار ہوتا تو احمق لوگ بلا روزی کے رہتے، مگر حق تعالیٰ بے وقوفوں کو اس طرح روزی پہنچاتا ہے کہ عقل مند حیران رہ جاتا ہے۔

میں نے ایک بزرگ سے سنا، انسان کی طبیعت کا تعلق جس طرح روزی کے ساتھ ہے اگر روزی دینے والے کے ساتھ ہو جائے تو مرتبہ میں فرشتہ سمجھے گئے نکل جائے۔ (گلستان ص ۱۹۰)

(اے انسان!) جب تو بے ہوش، پوشیدہ منی کا قطرہ تھا تجھے اللہ رب العالمین نہ بھولے، تجھے جسم، روح، شکل، سمجھ، گویائی اور حواس عطا فرمائے۔ ہتھیلی میں دس انگلیاں بنائیں۔ تیرے کندھے میں دو ہاتھ بنائے، کیا اب تجھے روزی دینا بھول جائیں گے؟

یاللعجب! (گلستان ص ۱۹۰)

روزی روزگار والا آدمی سکون سے خدا کی یاد کر سکتا ہے اور جس کی روزی کا ٹھکانہ نہ ہو اس کا دل پریشان رہتا ہے ایسا آدمی خدا کی کیا یاد کر سکے گا؟ پراگندہ روزی پراگندہ دل روزی ہر ایک کی مقرر ہے مگر اس کے لیے حرکت اور محنت کرنا ضروری ہے (ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کو اسلام پسند نہیں کرتا)

اگر پیٹ کی مجبوری نہ ہو تو کوئی جانور شکار کی جال میں نہ پھنستا بلکہ شکاری کو خود ہی جال، پھانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ (گلستان ص ۲۲۰)

مرسلہ: افضل راحیل..... کراچی



قسط نمبر ۱

# جلت سنہ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگذاز داستان جو کلاسیک داستانوں میں شمار ہوتی ہے..... جو روجبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھنیوں کا احوال جو حاکمانہ غرور کے کوپساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے نکرا جاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانہ عبرت ہے جو آنے والی نسلیوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان ”جگت سنگھ“ بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ”جگت سنگھ“ ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ ”جگت سنگھ“ کے کردار کا رومانی پہلو جو شروع سے آخر تک ”چندن“ اور ”ویرو“ کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔

”جگت سنگھ“ کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا؟ آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیرِ نظر کہانی میں ”جگت سنگھ“ کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے شیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

والوں نے بھی اپنے بستروں کو جھاڑ جھاڑ کر چارپائیاں کھڑی کر دی تھیں۔ قریب ہی بڑے کنوئیں پر چلنے والے رہٹ کی مسلسل آواز اس پر سکون زندگی میں کچھ ایسی رچ گئی تھی کہ اچھی لگنے لگی تھی۔ رتیا گاؤں کی جٹیاں گھڑے اٹھائے کنوئیں پر پہنچ رہی تھیں۔ گاؤں کے باہر سے آنے والی پگڈنڈی کسی سہاگن کی مانگ کی طرح دور تک سیدھی چلی گئی تھی۔ اسی پگڈنڈی پر ایک نوجوان اور اس کے پیچھے ایک بوڑھا رتیا گاؤں کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے حال کے پیچھے ماضی جا رہا ہو۔ بوڑھے کے سر پر صافہ تھا جس کا ایک سر ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ سفید سفیدی ہوئی موٹھیں بارعب چہرے پر بھلی لگ رہی تھیں۔ ایڑی سے بھی نچا تہ بند زمین پر لگ کر میلا ہو رہا تھا۔ بوڑھے کے ایک ہاتھ میں بی سی ڈانگ تھی جس

رات کے گہرے اندھیروں کو دن کے اجالوں میں بدل ڈالنے والا سورج روشنیوں کا امین، دورِ افق کی محلِ سرا کے سرخ پردوں کو کھینچ کر بے دار ہو رہا تھا۔ آسمان کی آنکھوں کے سرخ ڈورے گلہابی ہو چلے تھے اور کسی وقت بھی نیلگوں ہو کر روپہلی روشنی سے ہمکنار ہونے والے تھے۔ درختوں کی اوچی اوچی ڈالیوں پر تار بیک کی کہر مٹ چکی تھی اور روشنی کے قدم آہستہ آہستہ صبح کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں سے نکل کر دن کا سواگت کرنے چھبھاتے آسمانوں کی سمت رواں تھے۔

پنجاب کا چھوٹا سا خوب صورت گاؤں ”رتیا“ جاگ اٹھا تھا۔ کھیتوں پر کام کرنے والے کسان ہل کاندھوں پر لیے اپنے اپنے ڈھور و ڈنگروں کے ساتھ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر پہنچ چکے تھے۔ گرمی کی شدت سے بھاگ کر باہر کھلے آسمان میں سونے







ہی مرکز ہے۔ مجھے تو کسی نہ کسی دن پھانسی چڑھنا ہے اس لیے دشمن کے چاروں بیٹوں کو قتل کرنے کی ذمہ داری تنہا میری ہی رہنے دے تو درمیان میں نہ آ۔ تجھے ماں باپ کی خدمت کرنی ہے۔ جگت کو بڑھانا لکھنا ہے جو میں گھر کے لیے کرنا چاہتا تھا اب نہ کر سکوں گا۔ آ! میں اور تو ذمہ داریاں بانٹ لیتے ہیں۔ گھر تو دیکھ باہر کی ذمہ داریاں مجھ پر مگر دل کی دل میں رہ گئی۔ جگت سنگھ کو ظالموں نے راستے میں ہی مار ڈالا اور اب شیو سنگھ انتقام کی ایسی آگ میں جل رہا تھا جو صرف دشمن کے خون سے ہی بجھ سکتی ہے۔ مجبوری یہ تھی کہ پولیس ہر طرف پھیل کر شیو سنگھ کو تلاش کر رہی تھی اور دشمن تک پہنچنا شیو سنگھ کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ادھر شیو سنگھ سے بچنے کے لیے دشمن کے آ دی خود کو گاؤں میں محفوظ سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ شیو سنگھ کا پولیس کی نظر سے بچ کر گاؤں تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ جگت سے دشمنوں کو خطرہ نہیں تھا کہ جگت اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ گاؤں کا ہر آدمی جانتا تھا کہ پولیس گاؤں کے اطراف پھیل کر شیو سنگھ کو تلاش کر رہی ہے اور شیو سنگھ کا ایسے سے گاؤں آنا ناممکن ہے مگر ماں کا دل نہیں مانتا تھا۔ وہ اکثر انٹوں کو دروازہ کھولے دیر تک کھڑی رہتی ہر آہٹ پر چوکتی ہوا کی سرسرہٹ تک اسے متوجہ کر لیتی۔ وہ جتنی شاید اس کا بیٹا اس سے ملنے آئے پہنچا ہے مگر وہاں کوئی نہ ہوتا رات گزر جاتی اور ماں دوسری رات کا انتظار کرتی۔ جگت ماں کی بے چینیاں دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ نہ سکنا تھا۔

رات تاریک تھی جب شیو سنگھ دشمنوں کے خون سے پیاس بجھانے گاؤں کی طرف آیا۔ اس نے پگڑی اتار کر آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ابھی وہ گئے کہ کھیتوں میں گھسنے والی آوازاں کہ کسی اندھے نے پکار کر مدد چاہی۔

”سے کوئی جواندھے کو راستا بتائے۔“

شیو سنگھ نے آواز سنی اور سوچا کہ برے کام تو کر ہی

رہا ہوں ایک نیک کام بھی کر لوں تو اچھا ہے۔ اس نے اندھے کا ہاتھ تھامو اور گئے کہ کھیتوں سے ہٹا کر راستے پر لاکھڑا کیا۔ پھر اندھے کو وہاں چھوڑ کر وہ خود گئے کہ کھیت میں جا پہنچا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ پولیس نے اس کے لیے کھیتوں میں بھی جال پھیلانے ہوئے ہیں۔ ابھی اسے کھیت میں داخل ہوئے چند ثانیے ہی گزرے تھے کہ خطرہ محسوس ہوا۔ شیو سنگھ سمجھ گیا کہ پولیس کہیں قریب ہی ہے۔ اس نے تیزی سے اندر ہی اندر بڑھنا شروع کیا تاکہ خود کو کھیت کے بیٹوں سے بچا دے۔ اتنی دیر میں اس نے دیکھا کہ ذرا فاصلے پر پہلے چند مشعلیں روشن ہوئیں اور پھر یہ مشعلیں بڑھتی ہی گئیں۔ مشعلوں کی روشنی میں اسے پولیس والے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ شیو سنگھ سارا معاملہ بھانپ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا اس وقت یہاں سے فرار ہونے ہی میں بہتری ہے۔ بکڑا گیا تو دل کی آگ نہیں بجھا سکوں گا۔ پھر بھائی کا انتقام کون لے گا؟ وہ ایک گھنٹہ تک کھیت میں خاموش پڑا رہا تاکہ پولیس کو یقین ہو جائے کہ وہ یہاں سے فرار ہو چکا ہے۔ لیکن پولیس والوں نے تو جیسے وہاں سے نہ ہٹنے کی قسم کھائی تھی۔ جب وقت زیادہ ہو گیا تو شیو سنگھ نے خود سمجھل سمجھل کر پیچھے ہٹنا شروع کیا تاکہ راستا ملتے ہی نکل جائے۔ مگر راستے ہر طرف سے مسدود تھے۔ پولیس اتنی چونکا تھی کہ ذرا سی آہٹ ہوتی تو ہندوؤں کے منہ کھل جاتے۔ آخر شیو سنگھ نے پولیس سے بچنے کی ایک اور ترکیب سوچی۔ اس نے گولی ایک سمت داغی اور فوراً دوسری سمت نکل گیا۔ مگر یہ حربہ بھی ناکام ہوا۔ پولیس والے گولی کی سمت گولیاں تو ضرور برساتے مگر اس طرف بڑھتے صرف چند ہی لوگ۔ باقی سپاہی دوسری طرف بھی نظر رکھتے۔ گولیاں چل رہی تھیں اور رات کے سنائے میں ان کی آوازیں دور تک سنی جاسکتی تھیں۔

ان کھیتوں سے صرف آدھ میل دور تیا گاؤں آباد تھا جہاں شیو سنگھ کے ماں باپ گولیوں کی آوازیں سن کر اٹھ بیٹھے تھے اور ان کے کان اس وقت آنکھوں کا کام کر رہے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ شیو سنگھ گاؤں کی طرف آیا ہوگا اور یہ چھڑپ پولیس اور شیو سنگھ کے ہی بیچ ہو رہی ہے۔

رات بھر گولیاں چلتی رہیں۔ رات بھر تیا گاؤں جاگتا رہا۔ کبھی اگر گولیاں چلنی بند ہو جاتیں تو جگت اور اس کے ماں باپ پر موت کی افسردگی چھانے لگتی اور ان کے دل ڈوبنے لگتے۔ کیونکہ فائرنگ کا بندہ ہونا شیو سنگھ کی موت کی نشاندہی کرتا تھا۔ رات بھر وہ دعائیں مانگتے رہے۔ بیٹے کی زندگی کی دعائیں گولیاں چلتی رہنے کی دعائیں یہی گولیاں تو شیو سنگھ کی زندگی کی دلیل تھیں۔ رات گزرتی رہی اور دلیل صبح کے ساتھ گولیوں کی آوازوں میں کمی ہو گئی۔ شیو سنگھ کے پاس کارٹوس ختم ہو گئے۔ وہ پریشان ہو گیا مگر پھر بھی وہ زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ پولیس برابر گولیاں چلاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ شیو نے ہندو ایک ہاتھ میں تھامی اور دوسرے ہاتھ کو زمین پر رکھ کر تیا گاؤں کی مٹی بھر مٹی اٹھالی۔ ابھی وہ اس مٹی کو چوم کر اپنے ماتھے تک لایا ہی تھا کہ گولیوں کی ایک باڑ نے اس کے جسم میں شعلے بھر دیے۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بچھنے لگیں اور اعصاب ہنچ گئے۔ پولیس کی گولیوں کی آوازیں اب بھی گونج رہی تھیں۔ مگر اب ان سے بچنے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر گولیوں کی آوازیں یکھت بند ہو گئیں۔ دس گھنٹے کی مسلسل جنگ کے بعد سنا ہوا تو رتیا گاؤں میں ماں کا دم سینے میں رک گیا۔ وہ جان گئی کہ بیٹا مارا گیا۔ اس کی بائیس سال کی کمائی لٹ گئی۔ اب وہ شیو سنگھ کی موہنی صورت کبھی جیتی جاگتی نہ دیکھ سکے گی۔ آج اس کا ایک اور بیٹا خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ شیو

کے مرجانے کے بعد بھی نہ جانے کتنی گولیاں چلائی گئیں۔ پولیس جب اس کی لاش کے پاس پہنچی تو اس وقت بھی اس کے ایک ہاتھ میں ہندو اور دوسرے میں اس گاؤں کی مٹی تھی۔ شیو کو اپنی زمین سے کتنا پیارتھا یہ دیکھ کر پولیس والوں کی آنکھوں میں بھی بادل سے اندھے مگر دفعہ بادل برسنا نہیں کرتے۔ جگت اس وقت بارہ سال کا تھا۔ اب سوہن سنگھ کے گھر میں وہ تنہا بیٹا بچا تھا۔ سب کی امیدیں اسی سے وابستہ تھیں۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ وہ کھیتی باڑی کرے یا انتقام لے؟ اوپر تلے دو جوان بیٹوں کی موت نے ماں باپ کو بالکل مایوس کر دیا تھا۔ مگر جگت کے نانا نے اپنا فیصلہ نایا کہ انتقام جگت کے ہاتھوں ہی پورا ہوگا۔ اس نے جگت کو اس گاؤں میں چھوڑنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا اور تربیت شروع کر دی۔ پہلے جگت کو دکھایا گیا کہ لوگ شراب پیتے اور کیسے پیتے ہیں؟ پھر اسے شراب بنانا بھی سکھایا گیا۔ دھیرے دھیرے شراب پینا بھی آسنے لگا۔ نانا خوش تھا۔ وہ شراب کے نشے میں ڈوب جگت سے کہتا۔

”جا جگت! ذرا سامنے بیٹھے آ دی کو گالیاں تو سنا آ۔“ جگت جاتا اور شراب کے نشے میں خواخوہ لوگوں سے جھگڑے کرتا۔ ان سے لڑتا اور اپنے سے بڑوں کے مقابلے پر بھی جم جاتا۔ اب اسے بھی اس میں مزہ آنے لگا تھا۔ نانا نے لڑائی جھگڑے میں طاق کر کے اب اسے چوری کی تربیت دینی شروع کی۔ وہ بھی کسی کی مرغی کسی کی بکری اور کبھی بھینس تک چرا لاتا اور نانا شاباشی دیتا۔ اس کام میں بھی وہ بہت جلدی ہوشیار ہو گیا۔ کئی دفعہ وہ پولیس کے ہاتھ بھی چڑھا مگر نانا ہمیشہ اسے باتیں بنا کر چھڑایا کرتا کہ ”ابھی تو بچہ ہے چوری ووری کا اسے کیا گناہ؟“ دوسروں کے سامنے تو وہ جگت کو معصوم ہی کہتا مگر اکیلے میں ہمیشہ جگت کی















رام نے لکھن کی بات سمجھتے ہوئے تینوں سے کہا۔ ”اور اب ہم تینوں کو ہر وقت ساتھ رہنا چاہیے۔ خبردار بغیر ہتھیار کے کوئی گھر سے باہر نہ جائے۔“ ایک گھر کی چھت پر جگت کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں اور برابر والے مکان کے صحن میں جگت چار پائی پر لیٹنا کر ٹیٹیں بدل رہا تھا۔ اس کی نیند دور چلی گئی تھی۔ دور مگر بہت دور نہیں یہیں پڑوس کے مکان میں۔ وہ سوچتا رہا اور پھر منزل سے پہلے ایک سوڑ پر اس کی سوچ کے قدم رک گئے۔ اب وہ نہ سوچ

”تو یہاں کس لیے آئی ہے؟“  
 ویرو نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ ”چوری

”میں تیرا دشمن نہیں ورنہ ہم تو دوست ہیں۔“  
جگت کے ہاتھ میں پہلی مرتبہ کسی عورت کا ہاتھ آیا  
تھا۔ ایک انجانے جذبے سے اس کی گرفت مضبوط

”گاؤں جا رہی ہوں اس لیے نہیں آسکوں گی۔“  
جگت سمجھ گیا کہ مجھے جلانے کے لیے کہہ رہی ہے کہ







”تہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”ویرو! حلوے میں زہر تو نہیں ملا دیا؟ آخر  
بشمار کیا ہے؟“

”اس میں تو پہلے سے اتنا زہر بھرا ہے کہ قاتل

ڈالنا چاہیے کیونکہ حلوہ بنانا تو تیری ماں نے ہی مجھے سکھایا ہے۔“ نہ کہہ کر ورو مڑی اور تیزی سے

والہی ماں کے پاس پہنچے جا رہی ہے تو جلدی سے آگے بڑھ کر ویر و کور و کا۔ ویر و ایک جھٹکے سے رک گئی

یہ ایک جگت کی نظر ویر کی گردن پر پڑی جس پر نیل

و پرونے کہا۔  
”کمر بند“

جانوروں کی طرح مارتا ہے۔“

”اس کے بعد بھی تو مجھ سے ملنے چلی آئی۔“  
جگت نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا اور وروبولی۔

”ہوں اس لیے کہ تجھے زہر والا حلوہ جلدی سے

”اے! یہ تعویذ پہن لے تیرے لیے بنوا کر لائی

اس کے پاس کئی تو وہ سمجھا کہ اولاد کے لیے تعویذ لینے آئی ہوں۔ مگر میں نے اس سے کہا ماما جی ایسا تعویذ

جنت بولا۔ ”تو پھر یہ لعوید مجھے کیوں دے رہی ہے؟ اپنے شوہر کو دے میں تو اس کا دشمن ہوں۔ جو

ویرو نے جگت سے یہ بات سنی تو مسکراتے ہوئے

بات تو صاف صاف کہہ دیتا ہے۔ مگر سن یہ تعویذ میں

”ویو کیوں مجھے گناہوں میں شامل کر رہی ہے؟“

حفاظت کی تمنا گناہ ہے تو یہ گناہ بھی مجھے منظور ہے۔“

پر نظر ڈالی اور اسے خاموش پا کر جانے کے لیے مڑی۔  
چند ہی قدم چلی تھی کہ جگت نے پکارا۔ ”ویرو ٹھہریہ

تعوذ مجھے دے دے تو جس خلوص سے میرے لیے

یہ لای ہے وہ سیری یاد دلتائی بن کر، بیشہ میرے پاس رہے گی۔“

”میں بھی تجھے کچھ دینا چاہتا ہوں ویرو۔“  
ویرو نے مسکراتی آنکھوں سے جگت کی طرف

”ابھی نہیں بتا سکتا لیکن وعدہ کر جب کچھ دوں گا“

وہ نے جلدی سے کہا۔

سے کبھی بھی تعویذ کو خود سے الگ نہ کرنا۔“

بھی کھوئی ہوئی تھی۔ جگت کے خیالوں میں اتنی مگن تھی

نے جو کچھ دیکھا تھا وہ کھیتوں پر جا کر ویرو کے پتے تک پہنچا دیا۔

وعدے کے مطابق کھر سے نکلا۔ آج کی رات  
سے غائب ہونے کے لیے بہانہ بھی ہاتھ آ گیا تھا

والے رام ایلا دینھنے کے لیے جا رہے تھے۔ مال  
جگت کو روکنا چاہا مگر دوستوں کے ساتھ جانے کی سن

مطمئن ہو گئی۔ جگت تنہا نہیں جا رہا دوست ساتھ ہو

عید مبارک عید مبارک عید مبارک

پرکھا جکت کے پاس لاسی سنی چاٹو تھا اور وہ لعوید سی جو ورو نے دیا تھا۔ ختم سنگھ نے شکار کا اتا پتا بتایا۔ مکان کا

طے کی گئی۔ اگر کوئی گرفتار ہو جائے تو دوسرے

اس وقت دیرو کے مکان کا دروازہ بھی بند ہو چکا

مصیبت سے کٹے گی۔ دروازے کو کھنڈی لگاتے ہی

غصہ بڑھ گیا اور اس نے ایسی ٹھوکر ماری کہ وہ  
سامنے کا دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے

”بے حیا“ ذیل میں نے صبح کیا تھا پھر بھی اس غنڈے کے ہاں گئی تھی۔ آخر تیرا کون سا رشتہ ہے ج

کھینچنے لگا۔ ویرو نے تکلیف کی شدت کے باوجود اپنی

اور اس کے بعد جو ہوگا اس کے تصور ہی سے کانٹہ

کئی شوہر کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے اب  
درو کو حیدر دیکھ کر کہا۔

2 اگست 2013ء عید مبارک عید مبارک عید مبارک











گا۔“ یہ کہہ کر جگت دروازے کی طرف بڑھا مگر ویرو اس کے سامنے آگئی اور بولی۔

”جگت تجھے میری قسم تو جس طرح چپ چاپ یہاں آیا تھا اسی طرح واپس چلا جا۔“ جگت رگ گیا اور ویرو نے اسے پچھلی کھڑکی سے باہر نکال دیا۔

باہر دروازے شور و غل جاری تھا۔ ویرو کا خیال کر کے جگت کھڑکی سے کودا اور اپنے آنگن میں پہنچ گیا۔ ویرو نے جلدی سے کھڑکی بند کی لنگن اور انگوٹھی ڈبے میں چھپا دی۔ دوپٹے سے چہرے کا پسینہ پونچھا اور آہستہ سے کنڈی کھول دی۔ دروازہ کھلتے ہی سب سے پہلے موہن سنگھ اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا وہ غصے سے چیخا۔

”کیا کر رہی تھی تو..... اتنی دیر میں دروازہ کیوں کھولا؟“

”ذرا نیندا گئی تھی۔“ ویرو بولی۔

”نیندا گئی تھی۔“ موہن سنگھ چیخا۔ ”اور کون ہے اندر؟“

ویرو انجان بن گئی۔ ”اندر..... یہاں..... یہاں کون ہوگا۔“

اتنی دیر میں رام شیاام اور لکھن نے پورے گھر کی تلاشی لے لی تھی۔ موہن سنگھ نے ویرو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت غصے سے پوچھا۔

”بتا کہاں ہے وہ؟“ اور اس سے پہلے کہ ویرو جواب دے موہن سنگھ نے ویرو کو مارنا شروع کر دیا ویرو گر پڑی۔

لکھن نے کہا ”یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“

موہن سنگھ نے غصے سے کہا۔ ”ٹھیک طرح سے دیکھ لکھن آج بیچ کر کہاں جاے گا وہ؟“ اور ویرو کی پیٹھ پر زور سے ایک ڈنڈا مارا۔ ویرو کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ صحن میں کھڑے ہوئے جگت سنگھ نے جب ویرو

کی چیخ سنی تو وہ غصہ میں پاگل ہو گیا۔ اس نے اپنی ڈانگ اٹھائی اور پھر برچی نکال کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اس وقت موہن سنگھ نے ویرو کو مارنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا۔ جگت چیخا۔

”شیطان کے بچے عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے مرد ہے تو میرے سامنے۔“

موہن سنگھ نے مڑ کر جگت کو دیکھا تو کانپ گیا۔ اس کے تینوں بھائی بھی اس کے پاس آگئے۔ جگت نے انہیں پھر لاکارا۔

اب عجیب صورت تھی۔ پیچھے ہٹنے پر عورت کے سامنے ان کی بیٹی ہوتی تھی۔ چاروں نے ہتھیار سنبھالے اور سامنے آگئے۔ جگت بھی تیار کھڑا تھا اس میں ہمت تھی..... طاقت تھی..... اس کے علاوہ وہ دیوار پر کھڑا تھا اور یہ چاروں نیچے تھے۔

تکرار ہونے لگی اسی دوران شیاام اور لکھن نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن جگت نے دیوار پر سے انہیں ٹھوکر مار کر نیچے گرا دیا۔ اس بات پر شیاام کا غصہ بھڑک اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک برچی تھی۔ اس نے اچھل کر جگت پر وار کرنا چاہا مگر اس سے پہلے جگت ڈانگ میں لگی ہوئی برچی سے شیاام کے حلق کا نشانہ لے چکا تھا۔ قریب تھا کہ برچی شیاام کا کام تمام کر دے کہ اسی وقت شور و غل سن کر جگت کی ماں آنگن میں آگئی۔ اس نے جگت کے دونوں پیروں پر پکڑ لیے اور بولی۔

”بس بیٹا بس نیچے اتر آ۔“ ماں کی اس بات سے شیاام بچ گیا۔ ورنہ آج اس کی موت تو یقینی تھی۔

چیخ و پکار سے تمام محلہ جمع ہو گیا۔ جگت کا غصہ سے برا حال تھا۔ اس نے سوچا تھا آج یہ قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔ خاص طور پر وہ ویرو کے شوہر موہن سنگھ کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویرو پر ظلم کرنے والے اس بڑھے کو ختم کرنا ضروری تھا۔ اس نے موہن سنگھ کا

نشانہ لیا ماں چینی۔

”جگت! تجھے تیری ماں کی قسم ہے جواب ہاتھ اٹھائے۔“

ماں کی قسم پر جگت کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ محلے کے لوگ بیچ میں آگئے لیکن اس جھگڑے میں رام اور لکھن کے سر پھٹ چکے تھے۔ شیاام بھی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ مگر موہن سنگھ ٹھیک تھا۔ محلے کے لوگ دونوں گھروں کے درمیان جمع ہو گئے تھے اور سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی پرانی دشمنی پھر شروع ہوئی کون جانے اب کیا ہو؟

جگت اپنے کمرے جا کر کرونا تک کی تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ویرو کا دیا ہوا تعویذ گلے میں تھا۔ پھر کرونا تک کی تصویر میں اسے اپنے نانا کا چہرہ نظر آنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس سے کہہ رہے ہوں۔

”شباباش بیٹے! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ جاٹ کا بچہ جب تک اپنا بدلہ نہیں لے لیتا تو وہ چین کی نیند نہیں سو سکتا۔ بدلہ تو رشہ میں ملا ہوا قرض ہے اسے چکائے بنا چھوڑنا نہیں اور تجھے یہ قرض چکانا ہے۔“ جگت کچھ دیر تک صدمہ کھڑا رہا اور پھر کرونا تک کی تصویر کے سامنے جھک گیا جیسے شیر داو لے رہا ہو۔

دوپہر کے وقت جو جھگڑا ہوا تھا اس کی خبر شام تک دھرم پور بھی پہنچ گئی۔ نانا نے سنا اور اپنی مونچھ کو تان دیتے ہوئے بولا۔

”مجھے یقین تھا کہ جگت میری بات بھولے گا نہیں۔ وہ اکیلا ہی چاروں سے نیٹ لے گا۔ مگر آخر اس کی ماں کو بیچ میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ عورت کے خون میں ویسے بھی گرمی نہیں ہوتی۔ آج اگر یہ بیچ میں نہ آتی تو دو چار کا قرض تو جگت چکا ہی دیتا۔“

خبر لانے والے نے نانا سے یہ بھی کہا کہ جگت جب دشمن کے گھر میں داخل ہوا اس وقت دشمن کی بیوی اکیلی تھی۔ پھر دروازے اندر سے بند ہو گئے۔

یہ بات نانا کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ہاں اسے افسوس ہوا کہ اس نے ہزارہ سنگھ کو پہلے ہی جگت کے پاس کیوں نہ بھیج دیا؟ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی وقت ہزارہ سنگھ وہاں آ کر بولا۔

”بابا بہن کے گھر جھگڑا ہوا ہے آپ نے سنا؟ لیکن جگت سلامت ہے۔“

ہزارہ کے آخری الفاظ نانا کو بہت برے لگے۔ کوئی بھی بزدلانہ بات کرتا تھا تو نانا برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے غصے سے کہا۔

”جگت کو بھگوان ہمیشہ سلامت رکھے لیکن دشمن ابھی تک کیوں سلامت ہے ہزارہ سنگھ۔ بھلا یہ کوئی لڑائی ہوئی دو چار معمولی زخم تو ویسے بھی آ جاتے ہیں۔“

ہزارہ خاموش کھڑا رہا۔ نانا پھر بولے۔ ”ہزارہ! تجھے صبح ہوتے ہی ریتا پہنچنے والے ایک سے دو بھلے اور سن جب تک دشمن کا قرض نہ چک جائے اس گھر میں قدم نہ رکھنا تاکہ دنیا دیکھ لے کہ جگت ہزارہ کا بھانجا ہے اور ہاں اپنی بہن سے بھی کہہ دینا کہ مردوں کی لڑائی میں آئندہ وہ بیچ میں نہ آئے۔ اگر اب بھی درمیان میں آئی تو میں زندگی بھر اس کا منہ نہیں دیکھوں گا۔“

جگت کے نانا کا غصہ آج آسمان پر تھا۔ بوڑھے کی نظر میں جھگڑے میں ہارنے سے زندگی ہار جانا آسان تھا۔ وہ صرف جیت کا قائل تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خون کا یہ قرض جلد سے جلد ادا ہو جائے۔

جاٹوں کا اصول تھا کہ جیسے وہ لڑکی کے گھر کا کھانا نہیں کھاتے تھے اس طرح لڑکی کے سرال کی دشمنی بھی اپنے سر نہیں لیتے تھے۔ اگر یہ اصول مانع نہ ہوتا تو بوڑھا کب کا خود انتقام لے چکا ہوتا۔

صبح ہوتے ہی ہزارہ ریتا جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس نے جھک کر باپ کے قدم چومے۔ اس وقت پتھر دل باپ کی آواز بھی بھرا گئی اور اپنے بیٹے کے سر



**عید مبارک عید مبارک عید مبارک**















نظر آئے تو حملہ کرویں مگر اب تک ادھر وہی سناٹا تھا۔ جگت نے دونوں ہاتھوں میں پانی بھر کر منہ پر چھینٹے مارے اور پھر موہن کے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ”جگت!“ ہزارہ سنگھ موہن کے کھیتوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”وہاں تو ابھی تک خاموشی ہے۔“ جگت نے ہزارہ کی بات سن کر کہا۔

”جلدی کیا ہے اما! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے“ اور پھر انہوں نے دیکھا کہ موہن سنگھ کے دو بھائی چھپرے سے نکل کر کھیت میں دوسری طرف جا رہے ہیں۔ جگت ہزارہ سے بولا۔

”اثر ہو رہا ہے مگر یہ اس طرف کیوں گئے، ادھر کیوں نہیں آئے؟“ ہزارہ نے جواب دیا۔  
اکیلے آنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ کرائے کے آدمیوں کا انتظار ہوگا تو دیکھتا نہیں گھبرائے ہوئے ہیں۔“

ہزارہ کی یہ بات صحیح نکلی۔ تھوڑی ہی دیر میں دشمن کے دونوں بھائی انہیں واپس آتے نظر آئے اب ان کے ساتھ تین اور آدمی بھی تھے۔ جگت کے ساتھیوں میں سے ایک انہیں دکھ کر بولا۔

”معلوم ہوتا ہے آج ہنگامہ زور دراز ہوگا۔“  
 ”آئے دے ہم بھی تیار ہیں۔“ جگت نے  
 جواب دیتے ہوئے ڈانگ میں گئی برچھی نکال لی اور  
 دل ہی دل میں بولا۔

”چار بھائیوں میں سے آج دو کا تو قصہ ضرور ہی  
پاک کر دوں گا۔“

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ موبین سنگھ کے کھیتوں کا پانی بند کر کے جلّت نے انہیں مشتعل کر دیا تھا لیکن پھر بھی حالات کی نزاکت کا اندازہ کر کے وہ اس وقت کوئی جھگڑا کھڑا نہیں چاہتے تھے۔

جاٹ قبیلے میں دو پارٹیاں تھیں۔ جگت کے باپ

”دونوں کو ری سے باندھ کر کنوئیں میں الٹا سب مل کر ان پر حملہ کر گئیں۔“

”مگر یہ کس طرح ہوگا؟“ ہزارہ نے سوال کیا۔

”سب سوچنے لگے۔ جگت کا ایک رشتہ دار بولا۔“

”دوسرے نے کہا۔“

”بالکل ٹھیک ہے میرا کتارات بھر دونوں پر پہرہ دے گا۔ سزا ملے ہوئی تو جا رہی گھسیٹ کر ان دونوں کو خود ہی یہاں لڑنے آ جائیں گے۔“

یہ بات سب کو پسند آگئی گرمیوں کے دن تھے کھیتوں پر پانی پہنچانے کے لیے ایک ہی نالی بنی ہوئی تھی اور ہر کھیت کے لیے وقت مقرر کر دیا گیا تھا جگت سنگھ کے کھیتوں کو پانی مل جانے کے بعد موہن سنگھ کے کھیتوں کا نمبر آتا تھا اس لیے طے یہ پایا کہ جگت اور ہزارہ پانی کو روک کر بیٹھے رہیں اور بانی سب تھیار لے کر ماس ہی چھپ جائیں۔ جب وہ فرما د کرتے

”میرے بیوی بچے پریشان ہو جائیں گے پیٹ کی خاطر ہم پھنس گئے تھے ہمیں کیا خبر تھی کہ نہ نامرد ہمیں آگے کر کے خود بھاگ جائے گا۔ گروگرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہتا ہوں اس مرتبہ جانے دو پھر کبھی منہ نہیں دکھاؤں گا۔“ اسے روتے دیکھ کر جگت کو رحم آ گیا۔ بولا۔

”اسے اس وقت جانے دو کرائے کے آدمی کو یہاں آئیں تو ایک ساتھ حملہ کر دیا جائے۔

تجویز سب کو پسند آئی اور بات طے ہوتے ہی سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ ہزارہ اور جگت بھی گھر آئے لیکن اس طرح کہ جگت کے باپ اور ماں کو پتا نہ چلے کہ کوئی بات ہو گئی ہے۔ وہ جلدی جلدی کھانا کھا کر اوپر چلے گئے تاکہ کل کے معرکے کے لیے صبح تازہ دم آئیں۔

مارنے کا کیا فائدہ؟“ پھر جگت نے اس سے پوچھا۔  
 ”تیرا ساسی بھی کیا تیری ہی طرح ہے؟“

”ہاں“ دوسن گیکہوں کے لالچ میں موہن سنگھ کی باتوں میں آگئے تھے۔“ جگت مسکرایا اور آکر ان دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ دونوں موہن سنگھ اور اس کے بھائیوں کو گالیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ جگت ہزارہ اور ان کے آٹھ دس رشتے دار بیٹھ کر سوچنے لگے کہ آج کے اس حملے کا انتقام کس طرح لیا جائے؟ جگت نے کہا۔

”ہمیں ان کے کھیت میں نہ جانا پڑے بلکہ وہ خود چھپے اس کے اور کئی ساتھی بھی ہتھیاروں سے کیس چھپے بیٹھے تھے کہ دشمن کے کھیتوں میں ذرا بھی زندگی یہاں آ کر لڑیں ایسی ترکیب سوچنی ہے۔ تاکہ ہم







عید مبارک عید مبارک عید مبارک



پیارا گیا۔ اس نے ایک نظر نگن پر ڈالی اور اسے زور سے چوم لیا۔ مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ وہ کو اس کی ضرورت کا کیسے پتا چلا؟

بات یہ تھی کہ جس دن ہنگامہ ہوا اس رات ویرو نے اتفاقاً اپنے میاں اور لکھن کی باتیں سن لی تھیں جو وہ ویرو سے چھپ کر رہے تھے۔ موہن سنگھ کہہ رہا تھا۔ ”روپیہ چاہے کتنا ہی خرچ ہو لکھن! رام شیاں کو تو ہمیں چھڑوا ہی لینا ہے۔ مزہ تو آئے گا جب ہزارے کو کم از کم پانچ سال کال کوٹھڑی میں رہنا پڑے گا۔ اس لیے کہ جگت کے باپ کے پاس دو بیگھے زمین اور مکان کے سوا اور کیا ہے؟“

موہن تو یہ بات کر رہا تھا مگر لکھن کو اندر ہی اندر کچھ اور ہی بات کھائے جا رہی تھی۔ وہ بولا۔

”بھرا اب میں چھت پر اکیلا نہیں سوؤں گا۔ میرا بستر بھی تم دونوں میاں بیوی اپنے ساتھ ہی کمرے میں لگوا لو۔“

موہن نگہ یہ بات سن کر چونکا مگر پھر خود ہی ایک تجویز پیش کی۔

”ایسا کریں گے کہ میں اور تو ایک کمرے میں سو جائیں گے تیری بھابی الگ سو جایا کرے گی۔“

ویرو نے میاں کے منہ سے بزدلی کی یہ بات سنی تو اس کا دل نفرت سے اور بھر گیا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گئی جہاں اب تک کھڑی باتیں سن رہی تھی۔ موہن سنگھ کمرے میں آیا تو ویرو پہلے سے موجود تھی۔ موہن سنگھ نے آتے ہی بیوی سے کہا۔

”میرے اور لکھن کے لیے بستر ایک کمرے میں لگا دینا۔“

(ان شاء اللہ بابتی آئندہ ماہ)



”دیکھ جگت! کچھ بولنا مت تجھے ابھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس سے کچھ نہ کچھ کام تو چل ہی جائے گا۔“

”مگر تیرا یہ احسان میں کیسے اٹھاؤں ہنومان؟“ جگت نے تذبذب سے کہا۔

”تو اسے احسان سمجھتا ہے پھر تو میں بھی یہیں سمجھوں گا کہ یار کوئی چیز نہیں۔ تو جو مجھے تھانے پر چھڑانے آیا تھا وہ بھی احسان ہی کرنے آیا ہوگا۔“ ہنومان نے کہا۔

جگت نے اپنی جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں تو سامنے سے اسے ماں آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے جلدی سے وہ پوٹلی جیب میں رکھ لی کہ کہیں ماں نہ دیکھ لے۔ ہنومان نے جگت کی ماں کو سلام کیا۔

”سلام چاچی!“

جگت کی ماں ہنومان کے سلام کا جواب دیتی ہوئی گھر میں چلی گئی۔ اندر جا کر اس نے جگت کو بھی اندر آنے کو کہا۔ جگت ہنومان کو وہیں چھوڑ کر ماں کی آواز پر اندر چلا گیا۔ ماں نے جگت کو قریب بلا کر ایک رومال میں بندھی ہوئی کچھ چیزیں اس کی طرف بڑھائیں اور بولی۔

”ویرو گوردوارے میں ملتی تھی اس نے تجھے یہ بھجویا ہے۔“ ویرو کا نام سن کر جگت چونک گیا اور رومال لیے ہوئے فوراً چھت پر چلا گیا۔ وہاں جا کر جب جگت نے رومال کھولا تو اس میں جگت کے دیے ہوئے زیور نگن اور انگوٹھی کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ ویرو نے لکھا تھا۔

”جگت! برا نہ مانا! اس وقت انہیں بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لو وقت آئے تو اس سے بھی بڑا تحفہ لے لوں گی۔“

جگت نے ویرو کا خط پڑھا تو اسے ویرو پر ڈھیروں